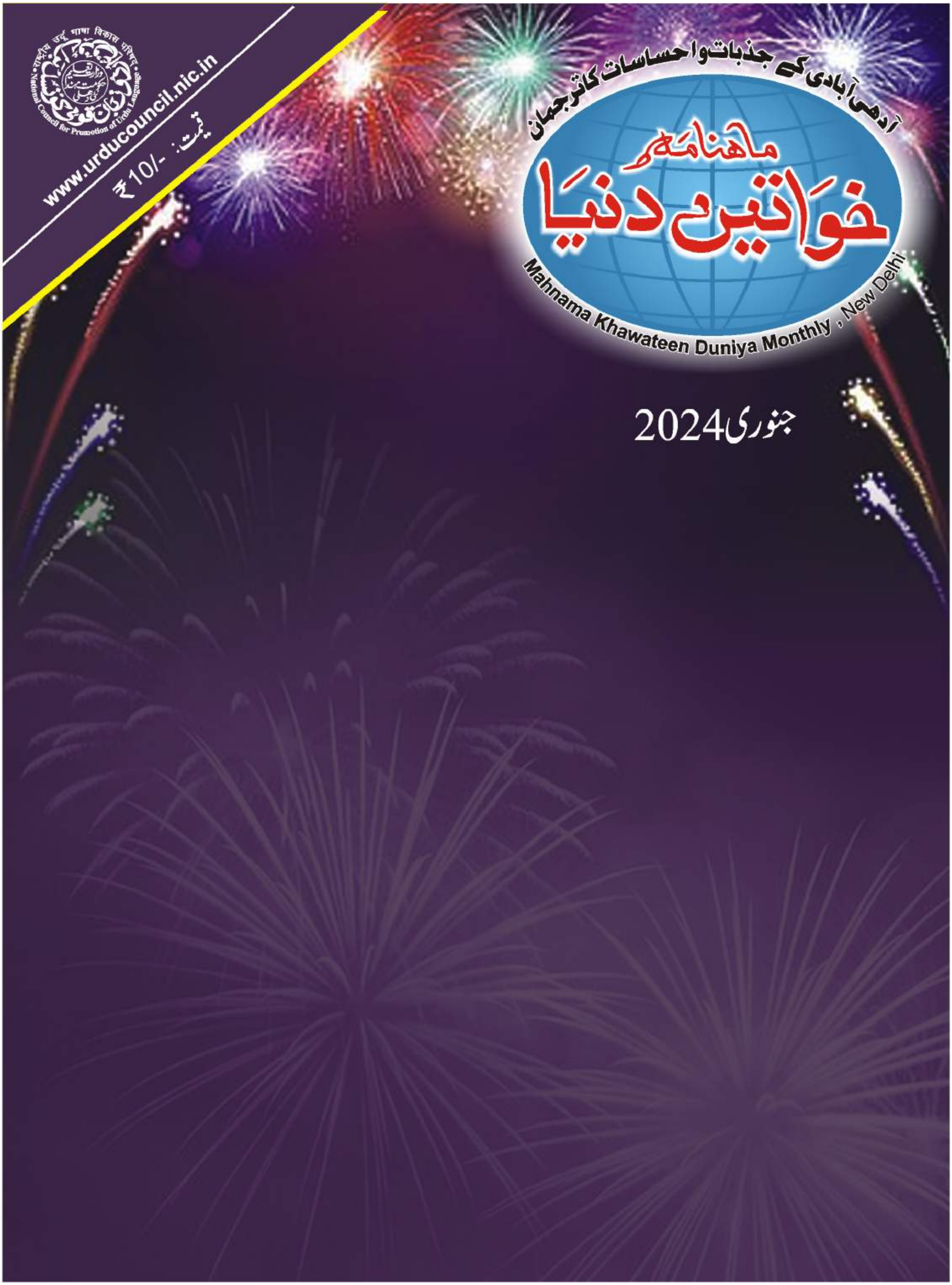

www.urducouncil.nic.in

قیمت : ₹10/-

آدھی آبادی کے جذبات واحساسات کا ترجمان

ماہنامہ

خواتین دنیا

Mahnama Khawateen Duniya Monthly , New Delhi

جنوری 2024

ادب اطفال کی دنیا میں اہم ترین سنگ میل

قومی اردو کونسل کی فخریہ پیش کش

پیاری پیاری نظمیں
دلچسپ کہانیاں
سائنس و ٹیکنالوجی

ماہنامہ
بچوں کی دنیا
دہلی
Monthly BACCHON KI DUNIYA, New Delhi

معلوماتی مضامین
صحتِ اطفال
بچّوں کا کتب خانہ

ان کے علاوہ:

کہکشاں ◆ زبان شناسی

میرا بچپن ◆ بچوں کے بڑے ادیب

بچوں کی پینٹنگ ◆ ڈاک خانہ جیسے مستقل کالم

اور بہت کچھ

سب سے زیادہ چھپنے والا بچّوں کا اردو رسالہ

قیمت فی شمارہ:10 روپے سالانہ:100 روپے

سالانہ خریداری اور ایجنسی کے لیے رابطہ فرمائیں

زرِتعاون سالانہ 100 روپے بنام NCPUL اکاؤنٹ نمبر: 90092010045326، A/C: IFSC: CNRB0019009 میں جمع کریں۔

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، وِنگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066
فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159، E-mail: magazines@ncpul.in
شاخ: 110-7-22، تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلکس بلاک نمبر 5-1، پتھر گٹی، حیدرآباد-500002 فون: 24415194 - 040

آدھی آبادی کے جذبات و احساسات کا ترجمان
ماہنامہ
خواتین دنیا
Mahnama Khawateen Duniya Monthly , New Delhi

جلد:8 شمارہ:1 جنوری 2024

مدیر اعلیٰ : پروفیسر دھننجے سنگھ

مدیر منتظم : ڈاکٹر شمع کوثر یزدانی

معاون مدیر : ڈاکٹر مسرت

ناشر اور طابع

ڈائرکٹر، قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان
وزارت تعلیم، محکمۂ اعلیٰ تعلیم، حکومت ہند
مطبع: ایس نارائن اینڈ سنز، بی۔88، اوکھلا انڈسٹریل ایریا
فیز-II، نئی دہلی۔ 110020
مقامِ اشاعت: دفتر قومی اردو کونسل
قیمت-/10 روپے، سالانہ -/100 روپے
صفحات: Total Pages 64

- قلم کاروں کی آرا سے قومی اردو کونسل (NCPUL) اور اس کے مدیر کا متفق ہونا ضروری نہیں

● ڈرافٹ NCPUL، New Delhi کے نام ارسال کریں

صدر دفتر

فروغِ اردو بھون، ایف سی 33/9، انسٹی ٹیوشنل ایریا
جسولہ، نئی دہلی-110025، فون: 49539000
نگارشات ارسال کرنے کے لیے
ای میل: kduniya@ncpul.in
editor@ncpul.in

شعبۂ فروخت

ویسٹ بلاک-8، ونگ-7، آر کے پورم، نئی دہلی۔ 110066
فون: 26109746، فیکس: 26108159
ای میل: sales@ncpul.in
شاخ: 110-7-22، تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلکس
بلاک نمبر 5-1، پتھر گٹی، حیدر آباد-500002
فون: 24415194 - 040

اس شمارے میں

اداریہ

مشعل مدیر 4

شخصیت

توران میرھادی، مادر ادبیات اطفال ایران ام سلمہ 5

نکہت سخن

شاعرات کے منتخب اشعار 9

جہان نسواں

'اندھیرا خواب' کی کردار نگاری ڈاکٹر سرفراز جاوید 10
صبوحی طارق کا تخلیقی ترجمان "درد کا گلاب" ڈاکٹر امیر حمزہ 15
'عالم پناہ' کا تنقیدی جائزہ ڈاکٹر ناز آفرین 18
شاعری میں اظہار کے امتیازات فہمینہ علی 24
نئی تعلیمی پالیسی اور مادری زبان میں تعلیم کی اہمیت صوفی سمائرا 31
ناولٹ "پرچھائیوں کا شہر": ایک نفسیاتی مطالعہ صائمہ 35
فارسی سے اردو میں ترجمہ شدہ چند داستانوں کا مختصر تعارف راحیلہ تبسم 39

مسائل نسواں

ہندوستان کے زرعی شعبے میں دیہی خواتین کا اہم کردار شبینہ بانو 42

حسن سخن

بشریٰ خاتون، آبگینہ عارف 46

افسانہ

اور جب نمود سحر مسکرا اٹھی خیر النساء علیم 48
احساس فوزیہ حبیب 54
باباجانی نیلوفر پروین 56

صحت

احساس محرومی اور خواتین ڈاکٹر اشرف آثاری 59

قارئین کے خطوط

مراسلہ 62

مشعل

ہر نیا سال ہمارے لیے نئی امنگیں اور آرزوئیں لے کر آتا ہے۔ نئے سال کی آمد پر ہم پر امید رہتے ہیں۔ ہم بہت خوش ہوتے ہیں اور نئے سال کا آغاز کچھ نئے اہداف کے ساتھ کرتے ہیں۔ یہ وہ لمحات ہوتے ہیں جب انسان زندگی کے گزرنے کے احساس کو بھول کر نئے عزم کے ساتھ نئے سال کی خوشی میں سرشار رہتا ہے۔ نئے سال میں ہمیں کہیں راحتیں ملتی ہیں اور کبھی کچھ اذیتوں سے بھی گزرنا پڑتا ہے۔

نئے سال پر ہم سب لوگ کچھ نئے اہداف کو حاصل کرنے کی کوشش میں لگ جاتے ہیں لیکن نئے سال میں ہم ان اہداف کو کس طرح سے پورا کر سکتے ہیں اس پر ہمیں غور و فکر کرنا چاہیے۔ ہمیں اپنے مقصد کو حاصل کرنے کے لیے ہمیشہ بے چین رہنا چاہیے اور ان اہداف کو مکمل طور پر پورا کرنے کے لیے رات دن ایک کر دینا چاہیے۔ زندگی متحرک رہنے کا نام ہے یہ کبھی نہیں رکتی اور ہمیشہ رواں دواں رہتی ہے۔ انسان ہمیشہ اپنی منزل کو حاصل کرنے کی فکر میں لگا رہتا ہے اور وہ چاہتا ہے کہ وہ اس کو آسان اور بغیر مشقت کے حاصل کر لے لیکن یہ ممکن نہیں ہے۔ بغیر محنت کے کچھ بھی حاصل نہیں کیا جا سکتا۔ انسان کو اپنی منزل کی تلاش و جستجو میں ہمیشہ بے چین رہنا چاہیے۔

جب بھی آپ کسی مقصد کو حاصل کرنے کی کوشش کریں تو اس کو اپنے آخری مراحل تک پورا کرنا چاہیے وقتاً فوقتاً آپ کو اپنے کاموں کا بھی جائزہ لینا چاہیے اور غور کرنا چاہیے کہ آپ نے اپنے ان کاموں میں کتنی دلچسپی لی اور کتنی محنت کی۔ آپ یہ بھی غور کریں کہ آپ کو اپنے کاموں میں کن کن رکاوٹوں کا سامنا ہے۔ آپ ان رکاوٹوں کو دور کرنے کی کوشش کریں۔ نئے سال کی منصوبہ بندی کرتے وقت ہمیں اپنا جائزہ بھی لینا چاہیے اور اپنی ترجیحات کو ہمیشہ اپنے ذہن میں رکھنا چاہیے۔ ہمیں اپنے مقاصد کے حصول میں منطقی اور استدلالی طریقوں سے کوشش کرنی چاہیے اور مثبت احساسات کے ذریعے آگے بڑھنا چاہیے اور مستقبل کو سجانے سنوارنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ پرانے سال میں ہم جن اہداف کو مکمل نہیں کر سکے کوشش کرنی چاہیے کہ نئے سال میں اسے پورا کر سکیں۔ ہمیں کامیابی کو حاصل کرنے کے بعد نئی کامیابی کی طرف پورے جوش و جذبے کے ساتھ آگے بڑھنا چاہیے۔

آپ تمام قارئین کو نئے سال کی مبارکباد۔

آپ کا

پروفیسر دھننجے سنگھ

آنکه رفت، آنکه آمد
توران میرهادی
نقاشی از: مهرنوش معصومیان

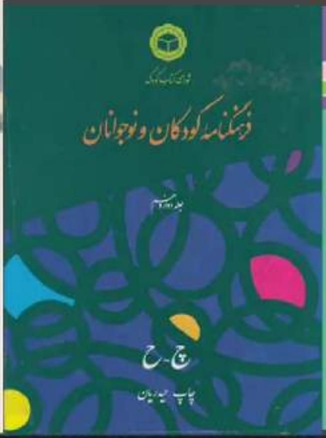

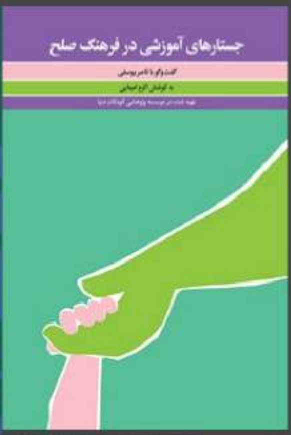

ام سلمہ

توران میرھادی

مادرادبیات اطفال ایران

مقدمہ: توران میرھادی کوان اہم اور بااثر شخصیات میں شمار کیا جانا چاہیے جنھوں نے حالیہ برسوں میں ایران کے بچوں کی بے حد خدمت کی ہے۔ چلڈرن بک کونسل کا قیام عمل میں لاکر انھوں نے بچوں کی بہترین کتابوں کو جاننے کے ساتھ ساتھ بچوں کے ادب کو صحیح طور پر جاننے اور سمجھنے کے لیے ایک ریفرنس پیدا کیا۔ بچوں اور نوعمروں کے لیے لغت شائع کر کے ایران میں انہوں نے بچوں کے ہاتھ میں رفرنس کتابوں کا ایک معتبر سلسلہ جاری کیا اور اس کے ساتھ ساتھ فرہاد اسکول کے قیام وانتظام کے ذریعے انھوں نے یہ دکھایا کہ تعلیم کن اصولوں پر مبنی ہونی چاہیے۔ انھوں نے ایسی کتابیں لکھیں جو ماوں، اساتذہ، چھوٹے اور نوعمر بچوں کے سرپرستوں کے لیے رہنمائی کا کام کرتی ہیں اور ہمیں سکھاتی ہیں کہ ہم دنیا کو بچوں کی نظر سے دیکھ سکتے ہیں جس کے لیے ہمیں ان سے بات چیت کرنے اور اسکولوں میں ایک دوسرے پر سبقت لے جانے والے مقابلے کو دوستی میں بدلنے کی ضرورت ہے۔ میر ھادی نے ساٹھ سال سے زائد عرصے تک بچوں کی تعلیم وثقافت اور ادب کے میدان میں کام کیا اور اس طرح وہ ایران کی موجودہ صدی کی بااثر شخصیات میں شامل ہوگئیں اور ایران میں انھیں 'بچوں کے ادب کی ماں' کے نام سے جانا جانے لگا۔

کلیدی الفاظ: چلڈرن لٹریچر، فرہنگ، چلڈرن بک کونسل، کنڈر گارڈن، اصلاح وتربیت، اطفال ایران

توران میرھادی کے حالات زندگی (1306-1395)

توران میر ھادی 26 جون 1306 میں تہران میں پیدا ہوئیں۔ ان کی والدہ "گریٹا ڈائٹریچ" ایک جرمن خاتون تھیں جبکہ والد "سید فضل اللہ" ایرانی تھے۔ والدہ شادی کے بعد ایران آگئیں اور تا حیات ایران میں ہی رہیں۔ توران اپنے پانچ بھائی بہنوں میں چوتھے نمبر پر تھیں۔ ان کی ایک بہن جس کا نام ایراندوخت میر ھادی ہے ایک مشہور ایرانی ڈاکٹر ہیں۔ ان کے والد صاحب، جنھوں نے جرمنی سے مکینیکل انجینئرنگ اور روڈ اینڈ کنسٹرکشن انجینئرنگ کی تعلیم حاصل کی تھی، رضا شاہ پہلوی کے دور میں

ایران کے نامور ٹیکنولوجسٹس میں شمار کیے جاتے تھے۔ رضا شاہ نے ایران کی قومی ریلوے کی تعمیر اور اس کو شروع کرنے کے منصوبے میں ان پر بھروسہ کیا تھا۔ توران کی والدہ گریٹا، جنھوں نے لڈوگ میکسیملین یونیورسٹی سے آرٹ کی تعلیم حاصل کی، میونخ میں تھیں، وہ پینٹنگ اور مجسمہ سازی کرتی تھیں۔ ایران میں کچھ عرصہ رہنے کے بعد، گھریلو کام کاج کے علاوہ، گریٹا نے کمال الملک کنزرویٹری میں کام کیا اور طلبا کو فن اور مجسمہ سازی سکھائی تھی۔ توران میر ھادی بچپن سے ہی دو ثقافتوں جرمن اور ایرانی کے ساتھ رہیں اور پلی بڑھیں۔ ان کے خاندان نے ان کی زندگی میں بہت نمایاں کردار ادا کیا۔

ابتدائی تعلیم: توران میر ھادی نے 1311 میں گھر سے باہر اپنی تعلیم کا آغاز کیا۔ سب سے پہلے چھ مہینے کے لیے مدرسہ آلیانس، خیابان ژالہ، تہران میں داخلہ لیا۔ اس کے بعد والدہ کے فیصلے کے مطابق، جنھوں نے ان کے لیے تین زبانیں، گھر پر جرمن، فارسی اور فرانسیسی ابتدائی اسکول میں سیکھنا مشکل محسوس کیا، آذر الیمنٹری اسکول، واقع سرچشمہ تہران، میں منتقل ہوئیں اور ابتدائی تعلیم اسی اسکول سے مکمل کی۔ اس کے بعد 1317 میں وہ قوام السلطانیہ اسٹریٹ میں واقع نوربخش ہائی اسکول گئیں اور 1324 تک اسی ہائی اسکول میں تعلیم حاصل کی۔

اعلی تعلیم: اسی سال 1324 میں ہائی اسکول کی تعلیم مکمل کرنے کے بعد انھیں تہران یونیورسٹی میں نیچرل سائنسز (حیاتیات) کے شعبے میں داخلہ ملا۔ میر ھادی نے ایک انٹرویو میں کہا: ”میری والدہ کا اصرار تھا کہ میں زراعت یا باغبانی کا مطالعہ کروں اور وہ اکثر کہا کرتی تھیں کہ ہر کسی کو ڈاکٹر یا انجینئر نہیں بننا چاہیے، ہمیں باغبانوں کی بھی ضرورت ہے۔۔۔ لیکن مجھے حیاتیات میں دلچسپی تھی۔۔“۔ آسٹریا میں توران کے بہن بھائیوں نے طب کی تعلیم حاصل کی اور توران نے بھی بچپن میں یہ سوچ رکھا تھا کہ وہ بالآخر ڈاکٹر ہی بنے گیں، باغبان نہیں۔

ایران سے باہر کا سفر: میر ھادی نے تہران یونیورسٹی میں نیچرل سائنسز کی تعلیم حاصل کرنا شروع کی لیکن اگلے سال ہی انھوں نے یورپ میں اپنی تعلیم جاری رکھنے کا فیصلہ کیا کیونکہ اس عرصہ میں ان کی ملاقات جبار باغچیبان سے ہوئی، جو بالغ خواندگی کو فروغ دیتے تھے۔ جبار باغچیبان کے ساتھ رہنے سے انھیں بنیادی تعلیم پڑھانے کی اہمیت کا اندازہ ہوگیا۔ اس کے علاوہ ایک آزاد طالب علم کی حیثیت سے وہ فیکلٹی آف لٹریچر میں محمد باقر ہوشیار کی کلاسز میں گئیں، جو اجوکیشنل سائنس اور اصول تعلیم پڑھاتے تھے۔ ان دو پروفیسرز سے حاصل ہونے والے تجربات نے انھیں اپنے پسندیدہ شعبے کو آگے بڑھانے کا عزم وحوصلہ دیا یہی وجہ ہے کہ انھوں نے نیچرل سائنس کے شعبے سے کنارہ کشی اختیار کر لی اور اجوکیشنل سائنسز و نفسیات کی تعلیم کے لیے یورپ جانے کا فیصلہ کیا۔ پہلے انھوں نے سویڈن جانے کا ارادہ کیا لیکن پھر 1325 کے موسم خزاں میں پیرس پہنچیں۔ اس وقت دوسری جنگ عظیم کے خاتمے کو ایک سال گزر چکا تھا اور یورپ جنگ اور بھوک کی شدت سے برباد ہو چکا تھا لیکن توران کی سیکھنے کی خواہش نے ان مشکلات کو اپنے مقصد کے راستے میں رکاوٹ نہیں بننے دیا یہی وجہ ہے کہ انیس سال کی عمر میں (دوسری جنگ عظیم کے خاتمے کے صرف ایک سال بعد) انھوں نے فرانس کی سوربون یونیورسٹی میں نفسیات کا مطالعہ شروع کیا۔

میر ھادی نے سوربون یونیورسٹی میں تعلیم نفسیات میں ڈگری مکمل کی۔ گریجویشن کے بعد انھوں نے پری اسکول میں اپنی تعلیم جاری رکھی۔ اس وقت پیرس بچوں کی نفسیات اور تعلیم میں جدت کا مرکز بنا ہوا تھا اور توران کو اس میدان میں دوسر کردہ شخصیات جین پیگیت Jean Piaget اور ہنری والن Henri Wallon سے تعلیم حاصل کرنے کا موقع ملا۔ وہ جان ڈیوی John Dewey اور ماریا مونٹیسوری Maria Montessori کی خدمات اور فلسفے سے بھی واقف تھیں۔ اس کے علاوہ اس عرصہ کے دوران ان کی ملاقات یورپ اور امریکہ کے عظیم معلمین جیسے فریڈرک فریبل Frederic Freibel، جوہان ہینرک Johann Heinrich، سیلسٹین فرینیٹ Celestine Frenet وغیرہ سے ہوئی۔

گھر سے دور انہی سالوں میں اسے اطلاع ملی کہ اس کا چھوٹا بھائی فرہاد ایک کار حادثے میں مر گیا ہے اور یہی ان کی زندگی کا سب سے بڑا دکھ تھا وہ خود کہتی ہیں کہ ”وہیں، میں نے اپنے آپ سے وعدہ کیا کہ ایران واپس آنے کے بعد، میں اپنے بھائی کی یاد کو زندہ رکھنے کے لیے ہر ممکن کوشش کروں گی“۔ اور اپنے آپ سے کیے ہوئے اس وعدہ کو انھوں نے بخوبی نبھایا جس کی کی تفصیل آگے آئے گی۔

ایران واپسی اور خدمات کا آغاز: توران میر ہادی 1330 ھ۔ش میں ایران لوٹیں جب ایران کے حالات کچھ ٹھیک نہیں تھے۔ جب وہ یورپ گئیں تھیں تو دوسری عالمی جنگ ابھی ختم ہوئی تھی اور اب جب وہ ایران واپس آئیں تو یہاں کے حالات سماجی و ثقافتی سرگرمیوں کے لیے موزوں نہیں تھے۔ تاہم انھوں نے ایک کنڈرگارٹن میں کچھ وقت گزارنے کا فیصلہ کیا۔ اس کام نے انھیں اپنے تجربے کو کام میں لانے کا موقع فراہم

کیا۔ انھوں نے کچھ وقت کے لیے نور بخش ہائی اسکول میں فرانسیسی زبان بھی پڑھائی جہاں کبھی انھوں نے خود تعلیم حاصل کی تھی۔ لیکن ان کاموں نے انھیں مطمئن نہیں کیا، وہ لگاتار کچھ بڑا کرنے کی خواہش میں اپنی سرگرمیاں بڑھاتی رہیں۔ اس دوران ان کی ملاقات جعفر وکیلی سے ہوئی جو اپنے زمانے کے دانشور افسروں میں سے ایک تھے۔ توران میر ھادی کی بعد میں ان سے شادی ہوئی اور پیروز نامی بچہ دنیا میں آیا لیکن افسوس ان کی یہ خوشی زیادہ دن تک قائم نہ رہ سکی اور ان کے شوہر کو 1332 ھ۔ش کی بغاوت کے بعد پھانسی دے دی گئی۔

کنڈرگارٹن اور فرھاد اسکول: توران میر ھادی اپنے والدین کے تعاون سے 1334 ھ۔ش میں فرھاد کنڈرگارٹن قائم کرنے میں کامیاب ہوئیں۔ انھوں نے اس کنڈرگارٹن کا نام اپنے مرحوم بھائی فرہاد کی یاد میں رکھا اور اپنے آپ سے کیا ہوا وعدہ کہ وہ اپنے بھائی کی یاد کو ہمیشہ زندہ رکھیں گی کو پورا کیا۔ یہ کنڈرگارٹن اور اس کے انتظام کے طریقے اتنے پرکشش تھے کہ اس نے بہت سے والدین کو اپنی طرف متوجہ کیا۔ یہی وجہ ہے کہ فرھاد اسکول کو ابتدائی اور مڈل دونوں سطحوں پر کھولنے کے لیے راہ ہموار ہو گئی۔ انہی دنوں توران کی دوسری شادی محسن خمرلو سے ہوئی اور انھیں فرھاد کنڈرگارٹن اور پرائمری اسکول کے انتظام کے لیے ایک نیا ساتھی اور حامی مل گیا۔ ان دونوں نے مل کر تقریباً 25 سال 1334 سے 1359 تک فرھاد تجرباتی تعلیمی کمپلیکس یا فرھاد اسکول کے انتظامات سنبھالے۔ یہ کمپلیکس ایران کے تجرباتی اور مثالی اسکولوں میں سے ایک تھا، جہاں جدید تعلیم کے مقاصد اور افعال کا تجربہ اور جائزہ لیا جاتا تھا۔ اس طرح اس اسکول میں سب سے پہلے جدید تعلیمی نظریات اور سوچ کو عملی جامہ پہنایا گیا۔

اس کے علاوہ توران میر ھادی چلڈرن بک کونسل کے بانیوں میں سے بھی ایک ہیں اور 1358 ھ۔ش کے بعد سے ''فرھنگ نامہ کودکان و نوجوانان'' جو کہ بچوں اور نوجوانوں کے لیے ایک لغت ہے، کی تالیف و تصنیف کی انچارج رہیں۔ توران نے لیلی ایمن آہی، معصومہ سہراب اور باقی ماہرین تعلیم کے ساتھ مل کر 1341 میں اس ادارے کی بنیاد ڈالی تھی۔ اس گروپ نے تعلیم کے شعبے میں ممتاز مشیروں کی طرح تعلیمی نظام کی تبدیلی میں اپنا کردار ادا کیا۔ اور بڑے پبلشرز کو بچوں کی ادبی کتابیں شائع کرنے کی ترغیب دی۔ حکومت کے ساتھ بات چیت اور مشاورت کے ذریعے وہ بالآخر بچوں اور نوجوانوں کی فکری نشوونما کے لیے ایک مرکز شروع کرنے کے منصوبے کو منظور کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ یہ مرکز محمد رضا پہلوی کے دور کے سب سے نمایاں اور موثر ثقافتی اداروں میں سے ایک تھا۔ دھاتی بچوں کی تعلیم کے لیے انھوں نے 'سپاہ دانش' نام سے ایک ادارے کی بنیاد ڈالی جس کے ذریعے وہ معلموں کی تربیت کرتے تھے۔ اس کے علاوہ قومی اشاعتوں جیسے اخبارات، رسائل، ریڈیو اور ٹیلیویژن جیسے ذرائع ابلاغ میں کام کر کے، یہ گروپ نو بالغ بچوں کے بارے میں معاشرے کے نظریہ کو تبدیل کرنے میں کامیاب رہا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ بچوں کی عدالتوں کی جگہ عوامی عدالت، اصلاحی مرکز کے بجائے عوامی جیل اور یتیم خانوں کی جگہ ادارہ اطفال وجود میں آئے۔ یہ اس طرح ممکن ہوا کہ 1340 ھ۔ش کی دہائی کے وسط سے اس گروہ کی کوششوں کی بدولت ایرانی معاشرے نے آہستہ آہستہ بچوں اور ان کی ضروریات کو لے کر اپنا نظریہ بدلا جس کا فائدہ یہ ہوا کہ بچوں کی اصلاح و تربیت صحیح ہوئی اور ان کی ضروریات کو سمجھا گیا جس کی وجہ سے بچوں کے اجرام میں بھی کمی واقعہ ہوئی۔

توران میر ہادی نے اپنے ہم خیال لوگوں اور کارکنوں کی مدد سے 1341 میں چلڈرن بک کونسل کی بنیاد ڈال کر بچوں کے ادب کے میدان میں ایک بہترین کام انجام دیا۔ بچوں کے لیے اچھی کتابوں کا جائزہ لینے اور متعارف کرانے کے لیے ایک الگ گروپ تشکیل دیا گیا اور اس طرح بک کونسل، نوجوان نسل کے لیے بین الاقوامی بیورو آف کتب کی رکن بن گئی۔ اس کے بعد 1358 میں بچوں کے لیے لغت مرتب کرنے کا منصوبہ پیش کیا گیا جس کی سرگرمیاں آج تک جاری ہیں۔

آخرکار، فالج کے حملے کے بعد، وہ ستمبر 2015 (شہریور 1395) میں ہسپتال میں داخل ہوئیں اور 18 نومبر 2015 (18 آبان ماہ 1395) کو 89 سال کی عمر میں انتقال کر گئیں۔ ان کی نماز جنازہ جمعہ 21 نومبر 2015 (21 آبان 1395) کی صبح ایرانی فنکاروں کے گھر کے باغ میں ثقافت و فن سے تعلق رکھنے والے افراد کی کثیر تعداد کی موجودگی میں ادا کی گئی۔ پھر ان کی نعش امام زادہ عبداللہ (شہرری) منتقل کی گئی اور ان کو ان کے بیٹے کی قبر کے پاس دفن کیا گیا، جو برسوں پہلے سیلاب کے دوران فوت ہو گیا تھا۔

توران میر ہادی کی تخلیقات اور کتابیں:

توران میر ہادی کی تخلیقات میں کتابیں، تراجم، لغات، مقالات، نصابی مضامین وغیرہ شامل ہیں۔ انھوں نے اپنی ساری زندگی بچوں کی تعلیم و بہبودی کے لیے کام کیا، دن رات ادبی کاموں میں صرف کیے، اپنے قلم سے ایسے بیش بہا کام لیے جو ہمیشہ معاشرے میں جنم لینے والی برائیوں کے زور کو کم اور اخلاقی قدروں کے معیار کو بلند کرتے رہیں گے اور بچوں کی

تربیت واصلاح میں مددگار ثابت ہوں گے۔

توران میر ہادی نصابی کتاب تصنیف بورڈ کی ایک رکن تھیں اور انھوں نے پرائمری اسکول کی چوتھی جماعت کے لیے سماجی تعلیم، تاریخ جغرافیہ، مذہبی تعلیم پر کتابیں لکھنے میں تعاون کیا۔ اسی طرح انھوں نے دو کتابیں پہلی، لائبریریوں کی اہمیت اور مطالعہ کی عادت پیدا کرنے میں ان کا کرداراور دوسری بچوں کو پڑھانے والے اساتذہ کی ورک بک، کنڈر گارٹن ٹیچر کا سالانا ورک پلان اور تدریس کے طریقہ کار جیسے نہایت اہم موضوعات پر لکھی۔

توران کا کہنا ہے کہ ادبیات اطفال میں ان کی دلچسپی تب سے ہے جب بچپن میں انھوں نے جرمن زبان مین دو کتابیں 'فیدل استار ماتس' اور 'مایا دختر گریزان از کندوٗ' پڑھیں۔ یہ ایسی کہانیاں ہیں جنھوں نے اسے زندگی بھر متاثر کیا۔ پہلی کہانی جنگ عظیم اول میں ایک لڑکے کی سرگزشت ہے۔ اس کہانی نے توران کو امن کا متلاشی بنا دیا اور ان کے اندر جنگ مخالف جذبہ پیدا کیا اور دوسری کہانی نے ان کے اندر معاشرے کے لیے کام کرنے کی تحریک پیدا کی۔

کتاب "آنکہ رفت وآنکہ آمد" وہ واحد کتاب ہے جو توران نے بچوں کے لیے لکھی اور اس پر مہرنوش معصومین نے مصوری کی۔ یہ تصویری کہانی چھوٹے بچوں کے لیے لکھی گئی ہے۔ اس کہانی میں مصنفہ نے ایک چھوٹے فرشتے کی کہانی سنائی ہے جو زمین پر آنے کا خواب دیکھتا ہے۔ وہ اپنے دل کا ایک حصہ بڑے فرشتے کو دینے کے بعد زمین پر آنے کی رضامندی اس سے حاصل کرتا ہے لیکن جب وہ زمین پر آتا ہے تو سورج، ہوااور سردی اس کے آرام میں خلل ڈالتی ہے۔ نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ وہ بیمار ہو جاتا ہے۔ کتاب کے آخر میں ہم پڑھتے ہیں: "پھول کی زندگی اتنی مختصر کیوں ہے؟ ننھے فرشتے کا آنا جانا اور مختصر زندگی اس سوال کا ایک لاجواب جواب ہے اور شاید ان لوگوں کے لیے جو ننھے فرشتے سے محبت کرتے ہیں ایک راحت ہے"۔

کمسن اور نوسال بچوں کی لغت فارسی زبان کی پہلی رفرنس بوک (کتاب) ہے جو تصاویر کے ساتھ لکھی گئی ہے۔ یہ ایک انسئیکلو پیڈ یک لغت ہے جسے 1358 میں توران میر ہادی کی تجویز پر منظر عام پر لایا گیا۔ اس کا مقصد بچوں کے لیے ایرانی ثقافت، فن اور تاریخ کے میدان میں مقامی کتابوں اور پڑھنے کے وسائل کی کمی کو پورا کرنا اور ترجمہ شدہ وسائل کی غیر موثریت کو ختم کرنا تھا۔ یہ لغت 26 جلدوں پر مشتمل ہے جن میں سے 13 اب تک شائع ہوچکی ہیں۔ حالانکہ یہ 10 سے 16 سال تک کے بچوں کے لیے لکھی گئی ہے مگر والدین، اساتذہ، لائبریرین وغیرہ بھی اپنے سوالوں کے جوابات حاصل کرنے کے لیے اس سے رجوع کر سکتے ہیں۔

ان کی اور بھی کتابیں ہیں جیسے "فہرست کتاب ھای مناسب شواری کتاب کودک"، "فیملی از مسائل آموزشی نوجوانان"، "جستجو در راہ ھا وروشھای تربیت"، "دو گفتار"، "انتقاد کتاب اطفال"، "انتقاد کتاب نوجوانان" وغیرہ۔ سب کا گنوانا یہاں ممکن نہیں بہرحال توران میر ہادی تو اس دنیا سے رخصت ہوگئیں لیکن اپنی بیش قیمت اور نفیس یادیں ان کتابوں اور اپنے کام کے ذریعے ہمارے درمیان چھوڑ گئیں۔ ان کے ثمر آور وجود کے جانے کے بعد اب زمانے لگیں گے ان جیسے کسی بلند مقصد کو پیدا ہونے میں جو بچوں کے ادب میں اس طرح کا کام کر سکے اور جس کی فکر کے سایہ میں بچے سر بلند ہوسکیں گے۔

حوالہ جات:

1 کاظمی، صدف، توران میر ھادی: مادر ادبیات کودک ایران، مجلّہ طاقچہ

2 فرخ زاد، پوران، (1381) کارنمای زنان کارای ایران (از دیروز تا امروز)، تہران، :نشر قطرہ

3 محمد ھادی محمدی، توران دختر ایران، موسسہ پژوھشی تاریخ ادبیات کودکان، تہران1385

4 نیکنام، پرویز، (1401) توران میر ھادی، از مدرسہ ی فرھاد تا فرھنگ نامہ ی کودکان ونوجوانان، آسو

5 قربانی، حسین، تحلیلی برآراواندیشہ ھای توران میر ھادی، پویش فکری توسعہ

6 نگاہی بہ زندگی مادر ادبیات کودک: توران میر ھادی، 18 آبان1400، کتاب نیوز

7 زندگی نامہ: توران میر ھای(1306۔1395)، ھمشہری آنلاین، 19 خرداد1389

8 صالحی، فراز، غم بزرگ را بہ کاری بزرگ تبدیل کنیم: توران میر ھادی، مادر آموزش وپرورش نوین ایران، فارسی TECHRASA

9 ناظران، الناز، توران میر ھادی کیست؟، بازی بوک، 3دی، 1401

Umi Salma
Girls Hostal H,K , Room No : S39
Department of Persian
University of kashmir
Hazratbal, Srinagar-190006 (J & K)
umisalma193@gmail,com

شاعرات کے منتخب اشعار

غمزدہ آپ کی صورت نہیں دیکھی جاتی
اپنے ہمدم کی یہ حالت نہیں دیکھی جاتی

میں کہ جن آنکھوں میں مہمان رہی ہوں برسوں
مجھ سے ان آنکھوں کی سدرت نہیں دیکھی جاتی

اسماءمقبول

دل کی بے چینی ہے طوفان بلا اے بانو
جس کی فطرت میں تلاطم ہے وہ دریاہوں میں

میں کہتی حال دل اپنا یہ جرأت تھی کہاں میری
تمھاری بخششوں نے مجھ سے کھلوائی زباں میری

بانوکاکوروی

ہائے کیا تابش خورشید و رم شبنم ہے
میرے احساس کی دنیا بھی ترا عالم ہے

دل سے مٹ جائے محبت کہ بنی نقش دوام
آج جو کچھ بھی نہ ہو جائے جنوں سے کم ہے

آمنہ برجیس

ہمارے پاس سے جاؤگے تم اگر تنہا
رہِ حیات میں بھٹکو گے عمر بھر تنہا

ہماری یاد کی شمعیں بھی ساتھ لے جاؤ
اندھیری رات میں لازم نہیں سفر تنہا

برکھارانی لکھنوی

اب مسافر کھی منزل نہیں پانے والے
راہ خود بھول گئے راہ دکھانے والے

بے سبب میں بھی زمانے سے پریشاں ہوں بہت
بے سبب مجھ سے پریشاں ہیں زمانے والے

پریتاواجپئی

تلاش دوست میں جو غم ملیں گے
وہ میرے حوصلوں سے کم ملیں گے

جہاں دنیا نگاہیں پھیر لے گی
وہاں اے دوست تجھ کو ہم ملیں گے

پھول لکھنوی

دل مضطر تری فرقت میں بہلایا نہیں جاتا
کسی پہلو سے یہ نادان سمجھایا نہیں جاتا

نمک پاشی مرے زخموں پہ یہ کہہ کہہ کے کرتے ہیں
ذرا سی بات پر یوں اشک بھر لایا نہیں جاتا

تسنیم ملیح آبادی

بیٹھے بیٹھے یہ میری آنکھ جو بھر آئی ہے
کسی کے آنے کی خبر باد صبا لائی ہے

ایک دو زخم ہوں دل میں تو دکھائے کوئی
چوٹ اس دل نے تو ہر بار نئی کھائی ہے

ثریاخان لکھنوی

(تذکرہ شاعرات لکھنؤ جلد اول، مرتب: ثمینہ فاروقی سال اشاعت2009،
نیوورک لائن آفسیٹ پریس، لکھنؤ)

ڈاکٹر سرفراز جاوید

'اندھیرا خواب' کی کردار نگاری

حجاب امتیاز اپنے عہد کی معروف ادیبہ تھیں۔ ان کے تین ناول ''ظالم محبت''، ''اندھیرا خواب'' اور ''پاگل خانہ'' ہیں۔ انھوں نے لوئیزا مے الکاٹ کے ناول 'Little women' کا ترجمہ اردو میں ''ننھی بیٹیاں'' کے عنوان سے کیا۔ یوں تو ان کے ناولوں اور افسانوں پر رومانوی تحریک کے اثرات نمایاں طور پر نظر آتے ہیں جن سے قطعی طور پر صرف نظر نہیں کیا جاسکتا ہے۔ تاہم ان کے یہاں انسانی نفسیات کا گہرا مشاہدہ ملتا ہے۔ ناول کے کرداروں کی حرکات وسکنات، ان کی نفسیاتی فہم کی مظہر ہیں۔ جو انھوں نے کرداروں کی کارکردگی کے ذریعہ صفحۂ قرطاس پر منتقل کرنے کی کوشش کی ہے۔

''اندھیرا خواب'' ناول 1950 میں دار الاشاعت پنجاب لاہور سے شائع ہوا۔ اس پر فرائیڈ کے نظریاتی اثرات مرتب ہوئے ہیں۔ کیونکہ جب یہ ناول لکھا گیا اس وقت علم وادب کے حلقہ میں فرائیڈ کے نظریات بڑی شدت سے زیر بحث تھے۔ حجاب امتیاز علی تاج کی ذہین اور حساس طبیعت پر اس کے اثرات مرتسم ہوئے۔ تو انھوں نے بھی نوع بشر کی زندگی کا مشاہدہ علم نفسیات کی رو سے کیا۔ انھوں نے اپنی تخلیقات میں علم نفسیات کو بروئے کار لاتے ہوئے، کرداروں کے عملی اظہار میں بخوبی برتا۔ وہ فرائیڈ سے کافی متاثر تھیں۔ حجاب کا یہ ناول کردار نگاری اور پیشکش کے تعلق سے فرائیڈ کی بہت سی نفسیاتی اصطلاحات کی تشریح معلوم ہوتا ہے۔ انھوں نے ناول کے دیباچے میں یہ اعتراف کیا ہے کہ یہ ناول ایک خواب کی مانند ان پر غالب ہوگیا۔ وہ داخلی دباؤ پر اس کو قلم بند کرنے پر مجبور ہوگئیں۔ جب یہ ناول پوری طرح لکھ چکی تو وہ جیسے خواب سے آزاد ہوگئی۔ بعدازاں مجھے یہ احساس ہوا کہ میں کسی سرزمین کی سیر کرکے لوٹی ہوں۔ اس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ حجاب کے لاشعور میں اس ناول کی کہانی کے تخلیقی اجزا کارفرما

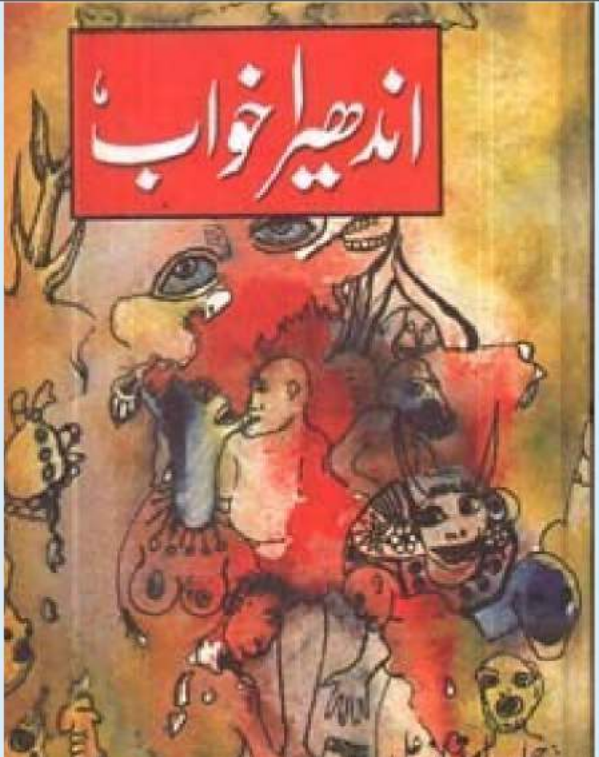

تھے۔ یعنی یہ کہا جاسکتا ہے کہ اس ناول کے لکھنے میں ان کے وجود پر خارجی محرکات کے بجائے داخلی واردات اثر انداز ہوئے ہیں۔ وہ اس بارے میں ناول کے دیباچے میں لکھتی ہیں:

> ’’میں نے تو وہی کچھ لکھ ڈالا جو اس وقت دل مجھ سے لکھوانا چاہتا تھا۔ کچھ وثوق سے نہیں کہہ سکتی کہ اس سب کا مطلب کیا ہے؟‘‘ (ص 10، دیباچہ، اندھیرا خواب)

حجاب کا ناول ’’اندھیرا خواب‘‘ انسانی نفسیات کی کشمکش کی کہانی کا مظہر ہے کیونکہ معاشرے میں کچھ آدمی بچپن کی فارغ البالیوں اور بہت سی محرومیوں اور تشنہ محبت سے دوچار ہوتے ہیں تو ان کی زندگی میں ناآسودگی کے باعث چڑچڑاپن جگہ پالیتا ہے۔ میرے مطالعہ کی رو سے یہی نفس مضمون اس ناول میں حاوی نظر آتا ہے۔ جس میں بین السطور رومانوی فکر زیریں لہروں کی طرح موجود ہے۔ ناول نگار نے نفسیاتی علم کے مطالعہ سے خاطر خواہ استفادہ کیا ہے۔ ناول میں کہانی کا تانا بانا تین پیڑھیوں سے تعلق رکھتا ہے۔ پہلی پیڑھی دادی زبیدہ جیسے عمر دراز افراد پر مشتمل ہے۔ جو اپنے مزاج و تمکنت سے ناول کی فضا میں عملی کردار روا رکھتے ہیں۔ دوسری نوجوان نسل اپنے دور کے بہت سے مسائل سے دوچار ہے۔ ان میں صوفی اور انجم اہم کردار ہیں۔ تیسری نسل قدامت اور جدید پرست نسل کے مابین ایک بچولیے کی حیثیت رکھتی ہے۔ ان میں چچا لوث اور ڈاکٹر گار اس نسل کے نمائندہ کردار ہیں۔ مگر یہ جذباتی اور ذہنی طور پر نوجوانوں کے قریب ہیں۔

حجاب نے ناول کے کرداروں کے ذریعہ انسانی نفسیات کا تجزیہ پیش کرنے کی خوب کوشش کی ہے۔ جس میں کرداروں کے نفسیاتی حقائق کو قارئین کے سامنے پیش کردیا ہے۔ ناول کے مطالعہ سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ناول نگار نے اپنے گہرے مشاہدہ سے کام لیا ہے اور خیالات کو الفاظ کے پیکر میں کیا خوب ڈھالا ہے، توجہ دیجیے:

> ’’ہماری نفرت ہمیشہ ہماری محبت کے سائے میں رہتی ہے۔ لاشعور کی نرالی اور نامعلوم راہیں تقدیر سے بھی زیادہ پیچیدہ ہیں۔ خط کے اختصار نے صوفی کو محبت کے اختصار کا یقین دلایا۔‘‘ (ص 11، دیباچہ)

ہم اچھی طرح جانتے ہیں کہ محبت اور نفرت کا تعلق انسانی دل و دماغ سے ہے۔ محبت انسان کے پیار کی اور نفرت غصہ کی علامت ہیں۔ مگر اندھی محبت اور نفرت دانش و بینش کی توہین ہے۔ ناول نگار کا یہ جملہ ’’ہماری نفرت ہمیشہ ہماری محبت کے سائے میں رہتی ہے‘‘ قابل توجہ ہے۔ کیونکہ حقیقی طور پر انسان میں محبت کا غلبہ ہوتا ہے، اسی لیے نفرت محبت کے سایہ میں ہی ہوتی ہے۔ یعنی محبت کی ڈھیل کے باعث نفرت کی نموپذیری اپنی جگہ پیدا کرلیتی ہے۔ ناول نگار اپنے الفاظ میں یہ بات کچھ اس طرح بیان کرتی ہیں:

> ’’ہم سب فقدانِ محبت کے مریض ہیں۔ کوئی کم، کوئی زیادہ، باہمی نفرت اور دبے ہوئے شدید غیظ کی آگ نے ہمیں جھلسا رکھا ہے۔‘‘ ایضاً (ص 13)

ماہر نفسیات مریض کی گفتگو سے اس کے ذہن کی کیفیت کا اندازہ کرلیتا ہے۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ کوئی بھی تخلیق کار ذاتی مطالعہ، تجربہ اور مشاہدہ کی رو سے اپنے ذہن کی کیفیت کو الفاظ کا پیکر عطا کرتا ہے۔ کسی بھی تخلیق کار کی یہ کیفیت معاشرتی طرز زندگی میں انسان کے حالات و کوائف کا تجزیہ ہوتی ہے۔ ادبی ناقد بھی اپنے مطالعہ، تجربے اور فکر کی رو سے کسی بھی تخلیق پر تجزیاتی رائے کا مجاز ہوتا ہے۔ اس کی رائے قابل توجہ ہوتی ہے۔ ہم حجاب کے ناول کے تعلق سے سید وقار عظیم کے تجزیے پر غور کرتے ہیں:

> ’’اندھیرا خواب، کی تخیلی اور رومانی فضا کو ایک طرف تو حقیقت سے دور کا بھی واسطہ نہیں اور دوسری طرف اس فضا میں پرورش پانے والے کرداروں پر اور ان کے اعمال اور افعال پر ’’فوق الانا‘‘ فرائیڈ اور ’’ایڈی پس‘‘ کا عکس نمایاں ہے اور تجزیے سے ہر انسانی عمل اور اس کی حرکت کی نفسیاتی توجیہہ و تاویل ممکن ہے۔‘‘ (ص 124، داستان سے افسانے تک)

’’اندھیرا خواب‘‘ ناول کے صوفی، انجم، ریحانی، روحی، دادی اور زبیدہ اہم کردار ہیں۔ ناول کے یہ تمام کردار ماحول و فضا میں اپنے فکر عمل کے ترجمان ہیں۔ ان کرداروں کی عملی کارکردگی میں ان کے نفسیاتی طرز فکر کا پتہ چلتا ہے۔ ہم اب اپنے مضمون کے عنوان کے تحت چند کرداروں کے نفسیاتی تجزیہ پر توجہ مرکوز کرتے ہیں۔

ناول میں ’صوفی‘ سب سے اہم کردار ہے۔ یہ کردار اپنی ذاتی زندگی میں بہت سی محرومیوں کے باعث ذہنی تناؤ اور پیچیدگیوں کا شکار ہے۔ فرائیڈ نے اپنے مطالعہ کی رو سے انسانی شخصیت کے شعوری اور غیر شعوری حرکت کے منبع کو تین خانوں یعنی (Id) جبلی، (Ego) خودی اور (Suprego) فوق الانا میں تقسیم کیا ہے۔ ہر صحت مند انسان میں ان تینوں کا توازن ملتا ہے۔ اگر کسی شخص میں ان اجزا کے توازن میں خلفشار یعنی غیر متوازن صورت پیدا ہوگئی تو وہ شخص ذہنی طور پر

Abnormal ہوجائے گا۔ اس شخص کی ذہنی اور عملی کارکردگی صحتمندانہ معمول کے برخلاف ہوجائے گی۔ ایسی ذہنی ونفسیاتی طرزفکر کا انسان معاشرتی یعنی اجتماعی طرزفکر کے برخلاف حرکات وسکنات کا مرتکب ہو گا۔ ناول میں صوفی کا کردار غیر متوازن شخصیت کا حامل ہے۔ وہ بچپن میں والدین کی شفقت اور محبت سے محروم رہتی ہے۔ کیونکہ اس کا باپ شرابی ہے، وہ اس کی ماں سے لڑائی جھگڑا کرتا ہے، جس کے اثرات صوفی کی شخصیت کو پیچیدہ بنادیتے ہیں۔ اس کے لاشعور میں والدین کے لڑائی جھگڑے کے تلخ حقائق، بچپن میں ہی اس کی طبیعت و مزاج میں جاں گزیں ہوجاتے ہیں۔ حجاب نے نفسیات کی رو سے اس کے بچپن کے ابتدائی دو سالوں کا ملحوظ رکھا ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ جب بچہ شعور کی دنیا میں پیش قدمی کرتا ہے تو وہ ایام طفولیت کی رضاعی دور کے جملہ واقعات کو بھول جاتا ہے۔ دو سال کی مدت میں صوفی کے اندرون میں شرابی باپ کے لیے محبت و نفرت کے متضاد جذبات ابھرتے ہیں، مگر وہ ڈھائی سال کی عمر میں یہ سب باتیں فراموش کردیتی ہے۔ سگمنڈ فرائیڈ کے نظریات کی رو سے فوق الانا یعنی Super Ego کی تشکیل کے دوران محبت و نفرت کے متضاد جذبات دب جاتے ہیں، مگر یہ متضاد جذبات کی کشمکش شعور سے لاشعور کے خانہ میں چلی جاتی ہے اور اپنے عمل پر گامزن رہتی ہے۔

صوفی کے ایام طفولیت میں اس کے والدین کے جھگڑے، مار پیٹ، باپ کی شرابی لال آنکھیں وغیرہ کے اثرات، اس کے لاشعور میں جمع ہوجاتے ہیں۔ جب وہ دس گیارہ سال کی عمر میں سرخ آنکھوں کے خرگوش کو دیکھ کر وحشت زدہ ہوجاتی ہے، حتیٰ کہ نفرت کے جذبہ سے مغلوب ہوکر اس کو مار کر خود احساس جرم میں مبتلا ہوجاتی ہے۔ وہ احساس جرم سے آزادی کے لیے دردِ گلو کے لطیف حیلہ کا سہارا لیتی ہے۔ وہ خود کو نفسیاتی طور پر اس بیماری میں مبتلا ظاہر کرتی ہے۔ یوں تو وہ بیس اکیس برس کی عمر کو پہنچ کر ایک خوبصورت دوشیزہ کا پیکر بن جاتی ہے۔ وہ اپنے منگیتر ریحان سے حد درجہ محبت کرتی ہے۔ تاہم وہ اس کی بابت عدم تحفظ کا شکار ہے۔ روحی جب صوفی سے یہ معلوم کرتی ہے کہ تم ریحان سے مکرر اظہار محبت کیوں کروانا چاہتی ہو، تو وہ اس بارے میں اپنا عندیہ ظاہر کرتی ہے کہ مجھے کسی مرد پر اعتبار نہیں۔ روحی، صوفی کا جواب سن کر یہ کہتی ہے کہ کیا تجھ کو اپنے باپ پر بھی بھروسہ نہیں ہے۔ یہ جملہ سن کر صوفی ایک اضطرابی کیفیت سے دوچار ہوتی ہے۔ لیکن فوراً خود کو سنبھالتے ہوئے محتاط انداز میں گویا ہوتی ہے کہ ان کا ذکر نہ کرو۔ کیونکہ وہ بچپن میں ایک باپ کی شفقت و محبت سے محروم رہی ہے۔ تو یہ محرومی اس کے لیے جوانی میں منگیتر ریحانی پر عدم اعتمادی میں مبتلا کرنے کا سبب بنتی ہے۔ یہی وجہ ہے، جب وہ ریحان کی سرخ نک ٹائی دیکھتی ہے تو اس کے اعصاب پر ہیجانی کیفیت طاری بھی ہوجاتی ہے۔ تو وہ ایک بار پھر دردِ گلو میں مبتلا ہوجاتی ہے۔:

> ”ایک دہشت کے عالم میں اس نے اپنی بند مٹھیاں کھول دیں اور بے اختیار اس کے ہاتھ ریحان کی گردن کی طرف اٹھ گئے۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے وہ ابھی چیل کی سی تیزی اور خمیدہ انگلیوں سے ان کی گردن دبا لے گی۔ وہ ایک نامعلوم طاقت سے اپنی انگلیاں کھولتی اور بند کرتی ہے۔ ان کی طرف بڑھی، لیکن پھر اس کے ہاتھ ریحان کی گردن کے بجائے اپنے گلے کی طرف چلے گئے اور میں نے دیکھا کہ وہ بے چینی سے اپنا گلا سہلا رہی ہے۔ پھر اس نے یکلخت اپنا گلا زور سے دبایا اور وحشت زدہ ہوکر چیخ پڑی …… وہ یوں بول رہی تھی جیسے کوئی خواب میں کہتا ہو، یہاں! اس جگہ میرے گلے میں درد ہے۔“ (ص 38-39)

صوفی کی اس حالت و کیفیت میں اس کے بچپن کی تشنہ خواہشات سے گہرا تعلق ہے۔ کیونکہ وہ سب خواہشات اس کے لاشعور میں مجتمع ہیں۔ وہ ان خواہشات کو اپنے خواب میں مجازی طور پر عملی جامع پہنانے میں کامیاب ہوجاتی ہے۔ وہ والد کو عالم خواب میں موت کے گھاٹ اتار کر خود کو ذہنی طور پر اذیت میں ڈال لیتی ہے۔ وہ خود کو اپنے والد کا قاتل تصور کرنے لگتی ہے۔:

> ”سلاخوں کے اس پار — خونِ کبوتر کی سی سرخ سرخ دو آنکھیں دہک رہی تھیں۔ وہ جھک کر انھیں غور سے دیکھنے لگی، دیکھتی رہی۔ پھر یک لخت ایک دھماکہ ہوا اور بڑے زور شور سے اس کی جبلتیں چیخ پڑیں۔ اس کا گلا دبادو، اسے مار ڈالو۔ ان دہکتی ہوئی سرخ آنکھوں کو ہمیشہ کے لیے بے نور کر ڈالو۔ شیر مادر کے ٹھنڈے ٹھنڈے گھونٹوں والی دنیا میں ان خون کبوتر کی سی دہکتی ہوئی آنکھوں کا کیا کام؟ آگ سے تشنگی نہیں بجھتی، شیر مادر کے ٹھنڈے ٹھنڈے گھونٹ چاہئیں مجھے۔ آگ کی تمازت نہیں، محبت کا تحفظ چاہیے۔ محبت کا ٹھنڈا سکون اور اعتماد چاہیے۔ مجھے محرومی نہیں چاہیے۔“ (ص 42)

خالق کائنات نے انسانی نفسیات کو انتہائی لطیف بنایا ہے۔ اس

کی کمال قدرت یہ ہے کہ اس نے انسانی نفسیات میں محبت و نفرت کا منبع قطعی ایک رکھا ہے۔ اس میں تبدل و تغیر بڑے عجیب انداز میں ہوتا ہے۔ ایک شخص کے دل و دماغ میں کسی انسان سے عمیق محبت کا جذبہ ہے، مگر تھوڑے سے کسی معاملے پر وہی جذبۂ محبت کا منبع جذبۂ نفرت میں تبدیل ہوجاتا ہے۔ مزید یہ بھی دیکھیے کہ ناول کے صوفی کردار کی نفسیات کے تعلق سے کہ جہاں سرخ رنگ اس کے لیے باپ سے نفرت کی علامت کا باعث تھا۔ لیکن جب وہ اپنے باپ کو عالم خواب میں قتل کردیتی ہے۔ بعدازاں وہی سرخ رنگ احساس جرم کی علامت بن جاتا ہے۔ یعنی اس کے لاشعور میں سرخ رنگ کی علامتی نوعیت کے اثر میں فرق پیدا ہوجاتا ہے۔ وہ بچپن سے جوانی تک بہت سی خواہشات کی تکمیل سے محروم رہی، جس کے باعث اس کے باطن میں محبت کا جذبہ شک و شبہ سے آلودہ رہتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ کسی شخص سے ٹوٹ کر محبت نہ کرسکی۔ وہ اپنے منگیتر ریحان کے تعلق سے شبہ میں پڑجاتی ہے، یہاں تک کہ وہ خواب میں منگیتر کو کسی لڑکی کے عشق میں مبتلا دیکھتی ہے۔ وہ اپنی سہیلی روحی سے اندیشوں و خدشات کا ذکر کرتی ہے۔ روحی ایک اچھی اور سمجھدار لڑکی ہے۔ وہ اس کو سمجھاتی ہے کہ تیرا شک بے جا ہے۔ کیونکہ ردّعمل کے طور پر اس کیفیت سے دوچار ہے۔ وہ اپنی ماں سے حسد کرتی تھی۔ وہ اس کی تلافی ،محبت میں شدت سے کرتی رہی ہے۔ وہ صوفی کو ”ایڈی پس“ کے کردار کے ذریعہ سمجھاتی ہے کہ اس کا سلوک ماں کی طرف نفرت بھرا کیوں تھا! صوفی اس معاملہ کی بھی نفی کردیتی ہے۔ حالانکہ وقت کی رفتار نے رفتہ رفتہ اس کے غصہ اور نفرت کو تہذیب و شائستگی کا لبادہ پہنادیا تھا۔ یعنی ”فوق الانا“ نے اسے مہذب بنادیا تھا۔ وہ ان سے نفرت کے بجائے محبت کرنے لگتی ہے تو دوسری طرف جوانی ہی میں طبقۂ نسواں سے متنفر بھی ہوجاتی ہے۔

صوفی کے کردار پر غور کرنے سے یہ احساس ہوتا ہے کہ صوفی ہیجانی کیفیت میں مبتلا ہوکر دوسروں کو نقصان پہنچانے کی کوشش کرتی ہے کہ تو وہ اپنے ناکردہ گناہ کو بیماری سے موسوم کرتی ہے اور اپنے احساسات کو دلاسہ دیتی ہے۔ ایک شرابی کو تھپڑ رسید کرنے والا معاملہ اس کی ہیجانی کیفیت کا عکاس ہے۔ وہ انھیں کیفیات کے ساتھ آہستہ آہستہ ریحان سے گریز کرتے ہوئے انجم کی طرف مائل ہوجاتی ہے۔ اس کے لاشعور میں شرابی شخص سے نفرت بڑی راسخ ہوجاتی ہے۔ دراصل یہ اس کے بچپن میں شرابی باپ کے منھ سے آنے والی شراب کی بو، اس کے گھر باپ کی آمد کی نوید تھی۔ تاہم وہ باپ کے اس فعل سے نفرت کرنے کے باوجود فطری طور پر محبت کرتی ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ وہ انجم کی شرابی شخصیت میں اپنے باپ کا عکس پاتی ہے تو اس کی جانب التفات کرتی ہے۔ انجم بھی کسی دوشیزہ کی بے وفائی کی خاطر آوارگی میں مبتلا ہوجاتا ہے اور صوفی بھی اپنی اس حالت و کیفیت کے لیے ریحان کو ذمہ دار اور مجرم قرار دیتی ہے۔ وہ کسی ایک مرد سے اپنی محبت کو صحیح طرز پر قائم نہیں کرپاتی، یعنی وہ اپنی جذباتی کیفیت میں شش و پنج کا شکار ہوکر شک یعنی ”اظلال“ سے دوچار رہتی ہے۔ یہ ”اظلال“ ادبی اصطلاح میں کسی انسان کی حقیقت سے روگردانی، فرار اور گریز کی کیفیت کا نام ہے۔ صوفی کی اس حالت و کیفیت میں، ریحانی اس کو بے وفائی کا طعنہ دیتا ہے اور انجم بھی اس کو چھوڑ کر چلا جاتا ہے۔

ناول کے مطالعہ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس میں صوفی کا کردار انتہائی پیچیدہ اور نفسیاتی کشمکش سے دوچار ہے۔ کیونکہ والدین کی شفقت و محبت سے محرومی کا احساس اس کی شخصیت میں نفسیاتی ہیجان پیدا کردیتا۔ یہی وجہ ہے کہ بہت سے لوگوں کی محبت اس کے بچپن میں نہ ملنے والی محبت کی تلافی نہیں کرسکتی۔

اس ناول میں انجم بھی نفسیاتی مریض ہے۔ وہ بھی ’ایڈیپس‘ کا شکار ہے۔ وہ ماں کی محبت و الفت سے محرومی کی تلافی جرائم کی دنیا میں پناہ لے کر کرتا ہے۔ وہ کہانی میں ڈاکٹر گار کے مریض کی حیثیت سے وارد ہوتا ہے۔ یوں تو وہ ایک گلوکار ہے۔ وہ محبوبہ کی بے وفائی کے سبب شراب نوشی میں مبتلا ہوجاتا ہے۔ وہ دق کا مریض ہونے کے ساتھ جرائم کا بھی عادی ہوجاتا ہے۔ وہ اپنی محبوبہ کا ہار چرالیتا ہے۔ تو وہ اسے جیل کی سلاخوں میں ڈلوادیتی ہے۔ یہاں پر اس کی شراب نوشی کی لت مزید پختہ ہوجاتی ہے۔ ہم ایسا سمجھتے ہیں کہ انجم کی گمراہی کا علاج صرف محبت تھی جو اس کو تمام عمر نہ مل سکی، حتیٰ کہ صوفی بھی اس سے بے وفائی کرتی ہے اور وہ جرم کی دنیا میں پناہ لے کر ایک مجرم بن جاتا ہے اور جیل خانہ کی صعوبتیں اس کا مقدر بن جاتی ہیں۔

ناول میں ریحانی کا کردار ایک وفادار اور سچے عاشق کے طور پر ضرور سامنے آتا ہے۔ صوفی اس کی زندگی ہوتی ہے۔ وہ مکر و فریب سے خالی ہے۔ وہ صوفی کو پریشان نہیں کرنا چاہتا۔ وہ اس کی ناز برداری بھی کرتا ہے۔ وہ صوفی کی نفسیاتی الجھنوں اور پریشانیوں کو اپنی ذات سے منسوب کرتا ہے، اس لیے اس کو اپنی محبوب پر بے حد بھروسہ ہے۔

ناول کا کردار روحی بھی کافی اہمیت کا حامل ہے۔ اس پر غور و فکر سے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ روحی کے روپ میں خود ناول نگار نے اپنے

کردار کو پیش کیا ہے۔ وہ ناول میں ایک ہمدرد، دوراندیش اور ایک ذہین خاتون کے طور پر سامنے آتی ہے۔ ناول نگار نے بذات خود فرائیڈ کا گہرائی سے مطالعہ کیا تھا۔ جس کے اثرات ان کی شخصیت میں در آنے ناگزیر تھے۔ انھوں نے اسی کا فائدہ اٹھاتے ہوئے صوفی اور انجم کے کرداروں کی تخلیق میں نفسیاتی طریقۂ کار اور تکنیکوں کو پیش نگاہ رکھا ہے۔ انھوں نے فرائیڈ کے ''تجزیۂ نفس'' کا عملی اطلاق صوفی اور انجم کے کرداروں میں بروئے کار لانے کی بہترین کوشش کی ہے کیونکہ روحی تجزیۂ نفس کی بہت سی اصطلاحوں کی مدد سے صوفی کی نفسیاتی کشمکش کا سراغ لگانے کے لیے کوشاں نظر آتی ہے۔ روحی ناول میں ماہر نفسیات کے روپ میں ابھر کر سامنے آتی ہے۔ وہ ناول کے دیگر کرداروں کی نفسیاتی الجھنوں اور ان کی عملی کارکردگی میں محرکات کو پیش نظر رکھتے ہوئے، ان کو متوازن حالت پر بحال کرنے کی کوشش کرتی ہے۔ اس کی تحلیل نفسی اور تجزیہ کی رو سے صوفی اور انجم فقدانِ محبت کے مریض تھے اور محبت ہی ان کی نفسیاتی الجھنوں کا ازالہ کر سکتی تھی، جو ان کو بچپن میں نہ مل سکی۔

ناول میں روحی کا کردار بذات خود حجاب امتیاز کا آئینہ دار معلوم ہوتا ہے۔ وہ اس دور میں جنگوں سے پیدا ہونے والی ہولنا کیوں، ظلم و جبر اور قتل و غارت گری کے ردّ عمل میں محبت کی قائل نظر آتی ہیں۔ ہم بخوبی جانتے ہیں کہ محبت کی دنیا اور فضا میں جرم اور مجرم کمزور پڑ کر گوشہ نشین ہو جاتے ہیں۔

□□□

Dr. Sarfaraz Javed
R-155,Gali No- 6,
Sir syed Road, Jamia Nagar
Okhla,New Delhi-110025

Subscription Form "Mahnama Khwateen Duniya"

سالانہ خریداری فارم

میں 'ماہنامہ خواتین دنیا' کا/کی سالانہ خریدار بننا چاہتا/چاہتی ہوں۔

100 روپے کا ڈرافٹ/منی آرڈر................................ بتاریخ..................................

بنام National Council for Promotion of Urdu Language منسلک ہے۔

میں نے زرِتعاون سالانہ -/100 روپے A/C: 90092010045326، IFSC:CNRB0019009

میں جمع کروادیا ہے۔

آپ 'ماہنامہ خواتین دنیا' ایک سال کے لیے اس پتے پر بھجوائیں:

نام : ....

پتہ : ....

....

اس فارم کو درج ذیل پتے پر بھیج دیں:

Sales Department: NCPUL, West Block 8, Wing7, RK Puram, New Delhi - 110066

فون: 011-26109746 فیکس: 011-26108159, E-mail:magazines@ncpul.in

دستخط

ڈاکٹر امیر حمزہ

صبوحی طارق کا تخلیقی ترجمان

’درد کا گلاب‘

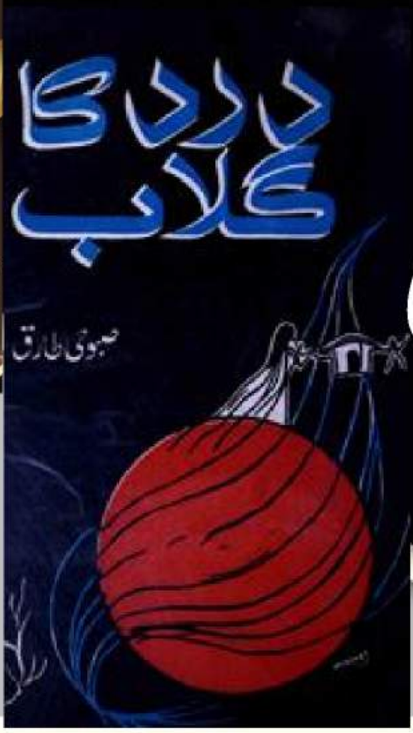

جھارکھنڈ میں اردو افسانے کی ماضی حال اور مستقبل کی بات نہ کرتے ہوئے اگر صرف افسانہ نگاری پر بات کی جائے تو صبوحی طارق کا نام اہم افسانہ نگار کے طور پر درج ہوتا ہے۔ صبوحی طارق کی پیدائش 15 اگست 1948 کو حیدرآباد میں ہوئی تھی اور وہ بارہ برس کی عمر میں رانچی میں مقیم ہو چکی تھیں۔ 1960 سے عمر رانچی میں ہی مقیم رہیں اور درس و تدریس کے ساتھ ادب کی خدمات انجام دیتی رہیں۔ ان کا پہلا افسانہ ”جنگلی پھول“ ماہنامہ ’عفت‘ کراچی میں 1962 میں شائع ہوا۔ اس کے بعد تا عمر تقریباً دو سو افسانے شائع ہو چکے ہیں۔ صبوحی طارق افسانوی درجہ بندی کے فن سے بخوبی واقف تھیں اس کا احساس اس بات سے ہوتا ہے کہ ان کا پہلا افسانوی مجموعہ ”درد کا گلاب“ 1987 میں شائع ہوتا ہے اور اس میں صرف بارہ افسانے شامل کیے جاتے ہیں۔ اس کے بعد تیس برس کی زندگی میں بھی وہ اپنا دوسرا افسانوی مجموعہ نہیں لا سکیں۔ شاید انہیں اس بات کا احساس رہا ہوگا کہ ہر افسانہ افسانوی مجموعہ میں شامل ہونے کے لائق نہیں ہے۔

”درد کا گلاب“ ایک افسانوی مجموعہ ہے اور اسی مجموعے کا آخری افسانہ بھی ہے۔ افسانہ نگار کی بات کی جائے تو انھوں نے ترقی پسند تحریک کو قریب سے دیکھا ہے اور جدیدیت کے دور کو مکمل طور پر جیا ہے۔ ان دو بنیادی معلومات کے بعد بہت ساری چیزیں قاری کے ذہن میں واضح ہو جاتی ہیں لیکن یہ بھی واضح رہے کہ موصوفہ کا کسی بھی ادبی گروپ سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ جیسا کہ انھوں نے خود لکھا ہے ”جہاں تک ادبی اور غیر ادبی تحریک سے وابستگی کا سوال ہے تو شاید میں وہ گنہگار رہوں جو کبھی بھی اس کار نیک میں حصہ نہیں لے سکی۔“ ان کے اکثر افسانوں کے مطالعے سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ انھوں نے مختلف موضوعات کے ساتھ رومانیت کی تفہیم میں مسائل کی پیش کش کو فوقیت دی اور اس طوفانی دور میں انھوں نے اپنی الگ راہ منتخب کر کے اپنی شناخت قائم کی ہے۔ گروہ سے الگ رہنے پر وہ ایک گفتگو میں کہتی ہیں ”ایک حساس انسان کے لیے مخصوص محرکات کی ضرورت نہیں ہوتی۔ اور بھاگتے وقت سے وہ کسی بھی ایسے لمحے کو اپنی گرفت میں لے لیتا ہے جو اس کے احساسات و جذبات کو چونکا دے۔ ممکن ہے میں افسانے صرف اس لیے لکھتی ہوں کہ میرے احساسات کو زباں مل سکے۔“ یقیناً ہر فنکار کی یہی خواہش ہوتی ہے کہ وہ اپنے احساسات کو بہتر طریقے سے اپنے فن میں اتار سکے۔ صبوحی طارق نے بھی اپنے احساسات کو افسانے کے پیرائے میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ پچاس سالہ ادبی سفر میں موصوفہ نے اپنے اہم احساسات کو جب قلم و قرطاس کے ذریعہ زندگی دینے کی کوشش کی تو ان کی تعداد ڈیڑھ سو سے تجاوز کر گئی۔ اسی کی ایک کڑی ”درد کا گلاب“ ہے۔

مذکورہ افسانہ صبوحی طارق کے دیگر افسانوں سے بطور موضوع اور تکنیک خاصا منفرد اور جدا ہے۔ جیسا کہ ماقبل کے ناقدین نے ان کے اکثر افسانوں کے حوالے سے یہ فیصلہ صادر کیا ہے کہ موصوفہ کے یہاں رومانس نمایاں طور پر نظر آتا ہے اور جب ایسے موضوع پر لکھا جاتا ہے تو اس کی

زبان میں بھی ایک جمالیات نظر آتی ہے جس کی بدولت اس کے تراکیب و استعارہ کی دنیا الگ ہوجاتی ہے اور قرأت میں بھی ایک قسم کی روانی پائی جاتی ہے لیکن یہ افسانہ دیگر افسانوں کے مقابلے بالکل الگ ہے۔ افسانہ ایک منجھے ہوئے ادیب کی زبان کے انداز میں شروع ہوتا ہے جہاں ہر جملہ قاری کو ایک غیر متعین تفہیم کی سیر کراتا ہے اور کہانی میں پیچیدگی داخل ہوتی چلی جاتی ہے۔ پروفیسر شین اختر موصوفہ کے افسانوں کے تعلق سے لکھتے ہیں ’’یہ جدید کہانیاں نہیں لکھتیں، یہ خود ساختہ علامتی افسانے بھی نہیں ہیں بلکہ ان میں جو اسرار و رموز ہیں وہ قابل فہم ہیں۔ ان کا ہماری تہذیبی، مذہبی اور سماجی زندگی سے گہرا رشتہ ہے یہ رشتہ علائم کی شکل میں ان دو کہانیوں (اذانوں کے پہرے، کندھوں کا کتبہ) میں ابھرے ہیں، یہ فلسفیانہ علائم نہیں ہیں بلکہ انھیں عام آدمی بھی سمجھ سکتا ہے۔ یہاں ترسیل کا کوئی المیہ نہیں ہے، یہ کہانیاں قاری کو پیچھے نہیں چھوڑتیں، اس کے ذہنی تفکر اور اپنے تخلیق کے درمیان ناقابل عبور خلیج نہیں پیدا کرتیں بلکہ یہ علائم اس کی رہنمائی کرتے ہیں۔ اشاروں سے حقائق تک پہنچنے کا یہ تخلیقی عمل ایک باشعور فن کار کی کامیابی کی سب سے اچھی مثال ہے۔‘‘ یہ تو ان کے دو مخصوص افسانوں کے حوالے سے بات کی گئی ہے جہاں پروفیسر شین اختر کا انداز تحسین و تدفیع دونوں جھلکتا ہے۔ تحسین کا پہلو یہ ہے کہ ان کے دو افسانوں میں علامتوں کے عمومی استعمال سے افسانوں کی خوبصورتی نمایاں ہورہی اور اس زمانہ کے ادق اور اغلق علامتوں کے رواج سے کنارہ کشی اختیار کر کے موصوفہ خود کو ایک باشعور فن کار ہونے کا ثبوت پیش کرتی ہیں۔ لیکن تدفیع کا پہلو یہ ہے کہ عمومی علامتوں کا استعمال افسانوں میں کوئی جدت یا نیا پن نہیں ہے بلکہ افسانہ کی ابتدا سے یہ روایت چلی آرہی ہے اس لحاظ سے تقریباً ہر تخلیق کار کے افسانوں میں یہ خیر و شر بطور علامت دیکھنے کو مل جاتے ہیں۔ عمومی علامتوں کے استعمال میں جدت تو یہ ہوتی کہ وہ علامتیں خود تراشی جاتیں اور قاری کے فہم سے قریب تر ہوتیں جیسا کہ شاعری میں خوبصورت تراکیب کی اہمیت ہوتی ہے جو عمدہ بندش الفاظ کو سامنے لاتی ہیں۔ شین اختر صاحب عمومی خوبصورتی کو خصوصی خوبصورتی کے پیرائے میں پیش کر کے چلے گئے لیکن جب میں نے اپنے نظریے سے ’’اذانوں کے پہرے‘‘ کو دیکھا تو وہ مجھے ایک عجیب فضا میں تخلیق کردہ افسانہ نظر آیا جہاں مخلوق خالق کے سامنے خود کلامی میں مصروف ہے، شروع سے ہی احساس ہوجاتا ہے کہ یہاں افسانہ نگار ہیں اور ان کا معبود۔ شروع میں تو ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے بال جبریل کی پہلی غزل کا موضوع ہو لیکن جیسے جیسے آگے بڑھتے ہیں تو محسوس ہوتا ہے کہ موصوفہ نے شکوہ کو پیش کردیا ہے اور پھر آخر میں دعا ہے۔ جب کہ ’’کندھو کا کتبہ‘‘ کی فضا تو یہی ہے لیکن دنیا الگ ہے۔ دونوں میں کہانی نہیں ہے صرف خود کلامی ہے۔ اب ’’گلاب کا درد‘‘ پر نظر ڈالتے ہیں تو اس کی دنیا کچھ اس طرح ہے کہ وہاں کہانی بھی ہے اور مکالمے بھی، منظر نگاری بھی ہے اور شعور کی رو بھی۔ افسانہ کسی ایک لمحہ میں قید بھی ہے اور لمحے سے باہر زندگی کی نمائندگی بھی کرتا ہے۔ اس میں زبان کی مٹھاس بھی ہے اور فلسفے کا آمیزہ بھی۔

افسانہ ایک تاریک منظر نامے سے شروع ہوتا ہے ’’وہ گرہن کی رات تھی‘‘ اور ٹرین کا سفر تھا اس موقع پر تاریک رات کی جتنی عمدہ منظر کشی ہوسکتی تھی وہ مکمل طور پر اس میں نظر آتی ہے جسے ایک ذی روح کی مانند پیش کیا گیا ہے۔ کیا خوب تاریکی ہے کہ ’’جیسے ہی ٹرین نے سرنگ کے اندر جھانکا اندھیرا کسی گھبرائے ہوئے مسافر کی مانند کمپارٹمنٹ در آیا وہ آنکھیں پھاڑے باہر تکتی رہی‘‘۔ ماحول مکمل طور پر تاریک ہے لیکن اچانک کوئی حسین لمحہ ذہن میں یوں کوندتا ہے جیسے ’’کہیں کہیں روشنی جگنو کی مانند لپکتی اور غائب ہوجاتی ہے‘‘ اور جب ماحول ایسا ہوتا ہے تو افسانے میں دو چار سطروں کی داخلی خود کلامی کا عنصر لاکر افسانہ کو مکالمے کی جانب لایا جاتا ہے اور پہلا مکالمہ یوں ظہور پذیر ہوتا ہے کہ ’’حارث کیا یہ راستہ واپس نہیں جاتا حارث کیا یہ راستہ واپس نہیں جاتا، کیا ایسا ممکن نہیں کہ ہم راہ کے پتھر ہی بنے رہ جائیں‘‘ جواب میں بھی مکالمہ آتا ہے جہاں تاریک ماحول سے نکالنے کی کوشش ہوتی ہے کہ اچانک کہیں دور موہوم سا شعلہ لپکتا ہے شاید کسی نے سگریٹ جلائی ہو۔ دور اور موہوم کی مناسبت سے افسانہ نگار کردار کو فوراً ماضی میں لے جاتی ہیں جہاں اس جانکاہ حالت میں موجودہ کہانی میں ایک ماضی کی واقعہ نگاری پیش کی جاتی ہے جب صابی بچی تھی تب اس نے ابو سے تنک کر کہا تھا کہ ’’ابو! ڈاکٹر نے تو سگریٹ کا نام زہریلا بتایا تھا۔ لیکن بیٹا یہ تو چار مینار ہے (چار مینار کی مناسبت بھی کیا خوب ہے کہ یہاں صبوحی طارق اپنا بچپن شہر کے ساتھ جوڑ دیتی ہیں) میں نہیں جانتی آپ ہمیشہ۔ سنو...... تم نے اسکول کا کام پورا کرلیا، ہمیشہ کی طرح وہ بات بدلتے۔‘‘ خود کلامی، مکالمہ اور شعور کی رو کے بعد پھر افسانے میں ایک قسم کا سناٹا چھا جاتا ہے اور پھر ذہن میں بے شمار پیدا شدہ خیالات سے افسانہ آگے بڑھتا ہے جہاں باپ اور بیٹی کے درمیان اتھاہ محبت کا سیلاب مانند لہروں کے موجودہ وقت سے ٹکرا رہا تھا۔ افسانہ نگار اسے بہت چابکدستی سے ابو کے یومیہ طرز زندگی میں سمیٹنے کی کوشش کرتی ہیں لیکن وہ لمحہ بہت طویل ہوتا ہے تو صرف فجر کے وقت کا منظر نامہ سامنے آتا ہے۔ پھر یادوں کے حسین لمحات کو وہ یادوں کے بوجھ میں تبدیل کرتے ہوئے فوراً وقت حاضر میں

آ جاتی ہیں اور خود کلامی میں یہ مکالمہ سامنے آتا ہے۔ ”ماں! یہ کیسی صبح ہے ...... یہ کیسے ہنگامے ہیں۔ کسی دن کو تو، تم چپ کر دو“ وقت حاضر میں اب تک افسانہ چل رہا ہے لیکن اچانک افسانہ میں ایک بہت بڑی تبدیلی سامنے آتی ہے جس سے قاری بھی متوقع نہیں ہوتا اور نہ ہی کہیں سے پہلے اس تبدیلی کا کوئی اشارہ ہوتا ہے۔ کیفیت حال کا یوں بیانیہ سامنے آتا ہے ”ماں ...... میں تھک گئی ہوں ماں! ...... بے پناہ! ......اس کی آواز اڈتی اور وہ ماں کے شانے پر سر رکھ دیتی۔ ماں ایک نظر اس پر ڈالتیں۔ اس کے سر کو سہلاتیں جیسے کہہ رہی ہوں یہ تمھیں کیا ہو گیا ہے؟ وہ گھبرا سی جاتی...... کسی کو تو کچھ نہیں ہوا۔ سب تو سوئے پڑے ہیں۔“ یہاں افسانہ نگار نے کس خوبصورتی سے خواب کی دنیا کی کیفیت کو افسانے میں سمویا ہے جو موضوع سے مناسبت اور کہانی کو معنی خیز طور پر آگے لے جانے میں بہت ہی زیادہ ممد و معاون ثابت ہو رہا ہے۔ اب تک کہانی کی بُنت کو دیکھیں تو رات کی تاریکی سے شروع ہوئی کہانی خواب کے خاتمہ کے ساتھ صبح کی کرن میں آ چکی ہے۔ اب ماحول میں ہلکا پن آتا ہے اور سورج کی روشنی کے ساتھ زندگی کا روشن پہلو بھی شامل ہو جاتا ہے۔ اب کہانی میں وہ مرحلہ سامنے آتا ہے جس کے لیے کہانی بنی جا رہی ہے یعنی صابی جو اب تک کہانی کو لیڈ کر رہی تھی اس کی زندگی میں حارث کا آ جانا۔ وہ لفٹ کی ایک موہوم کیفیت میں سامنے آتا ہے جہاں ”وہ حارث کی شناسا بھی نہیں اور حارث اس کو نا آشنا نہیں سمجھتا“ ایسے میں ایک مشفق باپ کی فکر سامنے آتی ہے جس سے تقریباً ہر ایک باپ گزرتا ہے کہ اپنی بچی کی شادی کہیں دور کیوں کرے کہ وہ رشتے کچے دھاگے کی مانند ہوتے ہیں۔ ایسے میں کہانی میں ابو اور امی کے مکالمے سامنے آتے ہیں جہاں امی رشتہ کی وکالت کرتی ہیں تو ابو خود کو حوصلہ نہیں دے پا رہے ہیں۔ ابھی تک کہانی میں کئی مناظر اور واقعات سامنے آ چکے ہیں لیکن سب ایک بڑے دائرے کے اندر چھوٹے چھوٹے دائروں میں بالترتیب لڑی کی مانند پروئے جا رہے ہیں۔ اب ایک نیا دائرہ سامنے آتا ہے لڑکی کی شادی میں باپ کی تکلیف کا کہ اس کی بچی اس سے کتنی دور چلی جائے گی اور وہ اسے دیکھ بھی نہیں پائیں گے۔ کہانی کا یہ دائرہ بیٹی اور باپ کی کشمکش میں پروان چڑھتا ہے اور پھر باپ کی زبان سے وہ جملے ادا ہوتے ہیں جو اس کہانی کا محرک بنتے ہیں۔ ”بیٹی تو درد گلاب ہوتی ہے، اپنے پیچھے دکھ و جدائی کے کانٹے ہی تو چھوڑ جاتی ہے۔ یہ درد میں سہن کر لوں گا بیٹا! تم آباد رہو......“ اب اس کے بعد یقیناً سفر کا منظر سامنے آئے گا اور کہانی ٹرین کے سفر کی جانب رواں ہو گی لیکن افسانہ نگار کا کمال یہاں سامنے آتا ہے کہ انھوں نے شروع میں قاری پر یہ قضیہ واضح ہی نہیں ہونے دیا کہ وہ کون سا سفر ہے، رخصتی کے بعد کا سفر یا وہ سفر جس کا ذکر صابی کے مکالمے میں آتا ہے کہ ابا میں جلدی لوٹوں گی۔ اس بیچ پھر طوفان و بارش کا سامنا اور صابی کے ذریعہ یہ باور کرانا کہ اس طوفانی بارش میں ابو اس کا خیال رکھ رہے ہیں۔ لیکن دونوں میں واضح ہوتا ہے کہ یہ حارث کے ساتھ ابو کے پاس واپسی کا سفر ہے جسے بہت ہی خوبصورتی سے افسانے کی ملول و مغموم فضا میں پرویا جاتا ہے کہ افسانے کا آخری منظر سامنے آتا ہے۔ ”بابل کے دروازہ پر حارث نے اس کو سہارا دیا۔ بھائی نے لپک کر اس کے کانپتے وجود کو تھام تھام لیا۔ بڑی دیر کر دی۔ میرا تار ملا تھا نا!۔ جانے کیوں حارث بھائی، ابو بہت چپ تھے، بہت خاموش تھے، انھوں نے کسی سے بھی کچھ نہ کہا، صابی کے بارے میں کچھ نہ پوچھا اور ہمیشہ کے لیے اپنی آنکھیں موند لیں۔“

گرہن کی تاریک رات سے شروع ہونے والا افسانہ زندگی کے ایک تاریک عنصر پر ختم ہوتا ہے۔ افسانہ کی تکنیک پر مکمل طور پر یہ گفتگو کا مقام نہیں ہے البتہ اشارات سے بہت کچھ سامنے آ چکا ہے۔ اس افسانہ کی سب سے بڑی خوبی میرے سامنے یہ ہے کہ اس خوبصورتی سے افسانے کو موصوفہ نے ترتیب دیا ہے کہ صابی کا داخلی کرب خارجی حالات سے مکمل طور پر میل کھاتا ہے۔ افسانہ کا پلاٹ پورے طور پر گٹھا ہوا ہے جس میں کہیں سے بھی کسی قسم کا ڈھیلا پن مجھے نظر نہیں آتا۔ زبان و بیان میں کہیں بھی کسی قسم کا الجھاؤ نہیں ہے۔ کہیں کہیں ایسا محسوس ہوتا ہے کہ موصوفہ نے خود کو بھی اس افسانہ میں پیش کیا ہے لیکن اگر کوئی افسانہ نگار سے واقف نہیں تو وہ اس احساس تک پہنچ بھی نہیں سکتا۔ الغرض جن بزرگوں نے افسانہ کے متعلق چاول پر قل لکھنا کہا ہے وہ صبوحی طارق کے اس افسانے میں بخوبی نظر آتا ہے۔

آخر میں اس امر کا اظہار کرنا مجھے خود تعجب میں ڈال رہا ہے کہ پروفیسر شمین اختر نے اور نہ ہی ڈاکٹر طہٰ شمیم نے مذکورہ افسانہ کا ذکر کیا ہے۔ یقیناً صبوحی طارق کو اس بات کا ملال رہا ہو گا کہ ان کے افسانوں پر خاطر خواہ توجہ نہیں دی گئی اور جن لوگوں نے توجہ دی ہے تو انھوں نے محض ضمنی طور پر انھیں شامل کر لیا ہے۔

□□□

Dr. Amir Hamza
Madarsa Mohalla
NawadaBishungarh
Hazaribagh-825312 (Jharkhand)
Mob. 8877550086

ڈاکٹر ناز آفرین

’عالم پناہ‘ کا تنقیدی جائزہ

عالم پناہ کے لغوی معنی ’’وہ شخص جو مخلوق کے لیے امن و آشتی کا سبب ۔‘‘ ہے ۔حقیقی معنی ’’ ساری دنیا کو پناہ دینے والا خالق کائنات ہے۔‘‘ یہ لفظ بادشاہوں کے لیے ادباً استعمال کیا جاتا تھا۔ رفیع منظور الامین لفظ ’’عالم پناہ‘‘ اپنے ناول میں ایک استعارہ کے طور پر استعمال کرتی ہیں۔ جس سے خود ان کی شخصیت میں چھپی ممتا و اپنائیت کا اظہار ہوتا ہے۔ ناول عالم پناہ واقعتاً کرداروں کے لیے پناہ گاہ ثابت ہوتا ہے۔

جب ہم 1980 سے قبل ناولوں کے مطالعے، کردار اور موضوع پر غور کرتے ہیں تو یہ بات سامنے آتی ہے کہ کسی ناول میں عورت کے لیے پرسنل اسسٹنٹ کا کردار پیش نہیں کیا گیا۔ یہ رواج مرد کے تصور کے ساتھ عام ہو چکا ہے۔ عالم کاری یا آزادیٔ نسواں کے اثرات کہیں کہ تخلیق کار نے پرسنل اسسٹنٹ کی جگہ ایک نوجوان لڑکی کو دے دی۔

اس ناول کو مصنفہ نے تین خانوں میں بانٹا ہے۔ پہلا خانہ دو بیواؤں کا ہے۔ دوسرا خانہ ایمن کی ملازمت کا ہے۔ تیسرا خانہ وقار جنگ کا ہے۔ (i) بیگم زمرد محل اور تسنیم پاشا سوتیلی بہنیں ہیں لیکن دونوں بہنوں میں بے حد محبت ہے۔ تسنیم پاشا بڑی سرکار کی تعظیم کرتی ہیں۔ ہر موقع پر انھیں سنبھالتی ہیں۔ بڑی سرکار کی ایک ہی اولاد آزر نواب ہیں۔ جن کی بہترین تعلیم و تربیت اور اخلاقی خصائل سے سارا خاندان خوش ہے۔ تسنیم پاشا کے بیٹے بشارت نواب اور بیٹی شاہانہ ہے۔ یہ دونوں اپنی نوعمری کی سبب

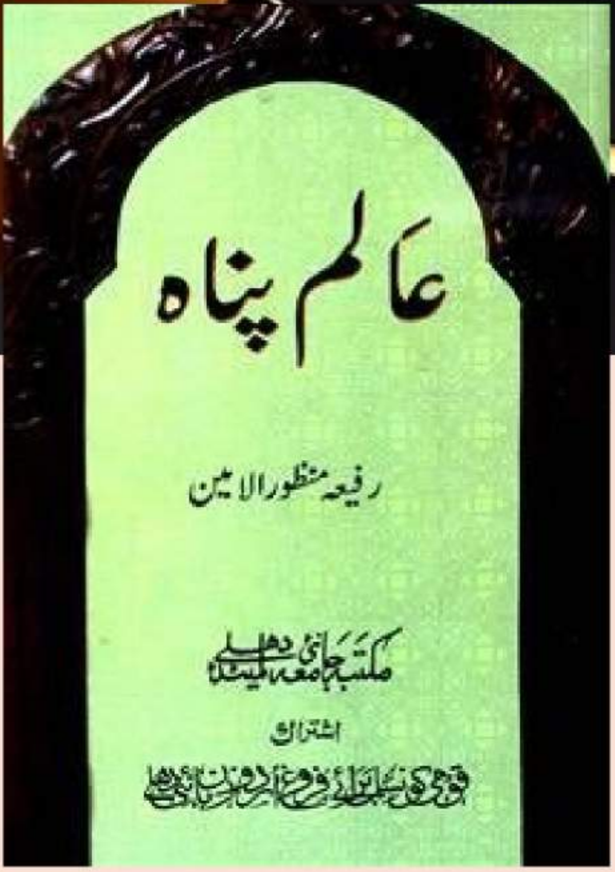
عالم پناہ

رفیعہ منظور الامین

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ دہلی

اشتراک

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نئی دہلی

قدرے ناسمجھ اور لا ابالی طبیعت کے ہیں۔ یہاں ہر فرد اپنی مرضی کی زندگی گزارنے پر قادر ہے۔ لیکن ان تمام افراد سے سرزد ہونے والی غلطیوں اور کوتاہیوں پر بڑی سرکار کی نظر رہتی ہے۔ ان کی اصلاح و تربیت کے ساتھ وہ انھیں موقع بہ موقع سرزنش بھی کرتی ہیں:

(ii) اسی طرح تسنیم پاشا خود کفیل تھیں لیکن بڑی سرکار کے مشورے پر 'فرمان' میں مستقل رہائش اختیار کر لیتی ہیں۔ وہ اپنے دونوں بچوں پر کبھی بیوگی کا احساس نہیں ہونے دیتیں۔ زیب و زینت اور ہائی سوسائٹی نے انھیں اس سے کسی قدر غافل کر دیا ہے۔ لیکن ان بچوں کو ممتا

کی کمی بعض اوقات محسوس ہوتی ہے۔ خاص طور پر بشارت نواب کو۔ شاہانہ کو اس بات کی کوئی شکایت نہیں ہے۔

واضح ہے کہ نسوانی کردار مرکزی حیثیت رکھتے ہیں۔ ''عالم پناہ'' کی خاص خوبی یہ ہے کہ طبقہ نسواں کے حالات سے ہمدردی کی گئی ہے لیکن یہ کردار نہ صرف حساس ہیں بلکہ اپنی عزت نفس کو ٹھیس نہیں پہنچنے دیتے کیونکہ وہ موجودہ حالات سے پوری طرح آگاہ ہیں۔ ساتھ ہی وہ بہتر مستقبل کے لیے کوشش کرتے ہیں۔ حالانکہ مصنفہ نے جن مسائل کا ذکر کیا ہے اس اعتبار سے بہ حیثیت نسوانی کردار حالات کی ستم ظریفی اور کسمپرسی کی زندگی سے دوچار نظر آنا چاہیے تھا لیکن ایسا نہیں ہے۔ ایسا اس لیے ہے کہ نسوانی کردار ضرورت سے زیادہ باہمت ہیں۔ یہ کہانی کا خاص وصف ہے۔ جہاں ناول اپنی فنی خوبیوں میں کامیابی کے ساتھ پیش کیا گیا ہے وہیں نسوانی کرادر کو پیش کرنے میں کچھ عجلت کا مظاہرہ محسوس ہوتا ہے۔

خواتین کا کردار

رفیعہ منظور الامین نے خواتین کے مسائل کو منفرد طریقے سے پیش کیا ہے۔ مرکزی کردار ایمن (جو اپنے اسم کی وضاحت ہے۔ اس کے لغوی معنی: دائیں جانب، مبارک، بے خوف، امن دیا ہوا، محفوظ، سرِ شام گایا جانے والا راگ۔ کہتے ہیں یہ امیر خسرو کی ایجاد ہے۔) ایمن تعلیم یافتہ ہے، باشعور ہے۔ اسے اپنی ذمہ داریوں کا احساس ہے۔ بالخصوص اپنے عزت نفس کو ٹھیس لگنے نہیں دیتی۔ اپنے ضمیر کا سودا نہیں کرتی۔ جب بات عورت کی انا پر آئے تو وہ مرد کو تھپڑ رسید کرنے سے گریز نہیں کرتی۔ یہی عورت جب ہمدردی پر آتی ہے تو مرد کو معاف کر اعلیٰ ظرفی کا مظاہرہ کرتی ہے۔ اسی طرح معافی مانگنا بھی جانتی ہے۔ مصنفہ نے ایمن کے کردار میں نم آنکھوں میں آنسوؤں کو ضبط کرنے کو ایک استعارہ کے طور پر پیش کیا ہے۔ کوئی بھی باہمت خاتون آنسو بہا کر غم ہلکا کرنے کے بجائے صبر و تحمل کے ساتھ صحیح وقت کا انتظار کرتی ہے۔ ایمن وقت و حالات کے تقاضے کو بخوبی سمجھتی ہے۔ وہ اس لائق ہے کہ اس پر جو بیتی ہے اس کا بدلہ لے سکے۔ اس لیے وہ آزر نواب سے اپنے بے عزتی کا بدلہ لاشعوری طور پر لینا چاہتی ہے۔ اپنی آنکھوں سے آنسوؤں کو باہر آنے سے روکنا بڑی ہمت کا کام ہے۔ اگر یہ بہہ جائیں تو اس کی کمزوری ظاہر ہوتی۔ لہٰذا وہ صبر و تحمل سے سب کچھ برداشت کرتی ہے۔ تین باتیں خصوصاً ایمن کی پختگی ظاہر کرتی ہیں۔ تھپڑ مارنا، آنسوؤں کو روکنا اور نوابوں سے بنا متاثر ہوئے اپنے اثرات مرتب کرنا۔ تینوں احساسات کسی بھی معاشرے کے لیے ضروری ہیں۔ مصنفہ نے ان مقامات پر اخلاقیات کے معیار کو نہ صرف پرکھا ہے بلکہ اسے کرداروں کے ذریعے سے بالکل واضح کیا ہے۔

ایمن کو ایمن بننے میں صدیاں گزر گئیں۔ تاریخ سے معلوم ہوتا ہے خواتین اپنی ذات پر ہونے والی زیادتیوں کو اپنا نصیب سمجھ کر قبول کر لیتی تھیں جب کہ ایمن کا آزر نواب کی گستاخانہ حرکت پر ہاتھ اٹھانا خود کے ساتھ انصاف اور خود حفاظتی کی بہترین مثال پیش کرتا ہے۔ خود حفاظتی لڑکیوں کو بولڈ بناتی ہے۔ یہ خوبی بھی ایمن میں موجود ہے۔ کہنے والوں نے شاید اسی کو آزادئ نسواں کا تصور دیا ہے۔ ایمن کا تھپڑ رسید کرنا مشرقی تہذیب میں نئی روایت ہے، کیوں کہ مصنفہ دور جدید کی پڑھی لکھی خواتین کی حسیت کو جگانا چاہتی ہیں۔ اس کردار کے ذریعہ انھوں نے اصلاح معاشرے کا کام لیا ہے۔ آزر نواب کے ضمیر کو جھنجھوڑنا مصنفہ کا ہنر ہے۔ اقتباس ملاحظہ ہو۔

> ''ایمن اس کی گرفت سے نکلنے کی ناکام کوشش کرتی رہی لیکن وہ گرفت کا ہے کو تھی فولادی شکنجہ تھا۔...... آخر اس کی آنکھوں سے غصے اور ہزیمت کے آنسو نکل آئے۔ کسی بگڑیل نواب زادے کو کوئی حق نہیں پہنچتا تھا کہ اس کی صنفی کمزوری سے فائدہ اٹھائے۔ وہ کوئی خام اور آوارہ چھوکری نہیں تھی، جو کسی بوالہوس رئیس زادے کی عارضی دلچسپی کا سامان بن جاتی۔ وہ ایسے دس سڑک چھاپ شیدائیوں سے نپٹ سکتی تھی۔ لیکن یہ شب خون اچانک ہوا تھا۔ جس کے لیے وہ ذہنی طور پر بالکل تیار نہیں تھی۔''

(رفیعہ منظور الامین، عالم پناہ، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ دہلی 2012، ص:63)

اس کے باوجود ایمن نے اپنی پوری قوت اعتمادی و حوصلے سے کام لیا۔ اس نے اپنے حواس مجتمع کیے اور اپنے ہاتھ ہوا میں لہرایا اور آزر نواب دم بخود رہ گئے:

> ''گرفت ڈھیلی ہوئی اور وہ تڑپ کر ان آہنی بانہوں سے نکل گئی۔ وہ آنکھیں اب بھی اسے فاتحانہ انداز سے دیکھ رہی تھیں۔ وہ ہونٹ اب باقاعدہ مسکرا رہے تھے۔ جواب میں ایمن کا ہاتھ اٹھا اور ایک بھرپور تھپڑ اس نوجوان کے چہرے پر پڑا۔ اپنے جملے کا تاثر دیکھے بغیر وہ بھاگ کھڑی ہوئی اور گلیاری میں داخل ہوتے ہی اس نے اندر سے دروازہ بند کر لیا۔''

(رفیعہ منظور الامین، عالم پناہ، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ دہلی 2012، ص:63)

جب بھی ہم اخلاقیات کی بات کرتے ہیں یا دانشوروں کے کاوشوں کی مثال دیتے ہیں تو ان کے پیچھے ان کے صبر و تحمل اور حوصلے ان کی

کامیابی کا راز ہوتا ہے۔ اسی راز کو مصنفہ نے ٹھہرے ہوئے آنسوؤں کی شکل میں بیان کیا ہے۔ آنکھوں کے پانی کا جم جانا خواتین کی اس جنگ کا المیہ ہے، جس کا انتظار حوّا کی بیٹی کو ازل سے ابد تک رہا ہے۔ اگر یہ آنسو بہہ جاتے تو شاید اس کا غم بہہ جاتا۔

رفیعہ منظور الامین نے ایمن کے ذریعہ سے مادیت پرستی پر اخلاقیت کو ترجیح دی ہے۔ یہ اسی وقت ہوسکتا ہے جب بیٹی کی پرورش ایسے ماحول میں ہوئی ہو جہاں والدین نے تعلیم و تربیت پر خاصی توجہ دی ہو۔ اس کے ساتھ صنفی تفریق نہیں کی گئی۔ اسے بھی علم حاصل کرنے کے مواقع فراہم کیے گئے ہوں۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو ایمن کی شخصیت نکھرنے سے پہلے ہی دب جاتی۔ پورے ناول میں ایمن کا کردار اس اعتبار سے مرکزی حیثیت رکھتا ہے۔ وہ زندگی کے اتار چڑھاؤ میں کبھی بھی اپنی انانیت کو ٹھیس پہنچنے نہیں دیتی۔ وہ اپنے اغراض کو فرائض پر ترجیح دیتی ہے۔ اپنے حقوق کو بالائے طاق رکھ کر دوسرے کے حقوق ادا کرنا اپنا فریضہ سمجھتی ہے۔ وہ نہ کبھی محلوں کے ماحول سے متاثر ہوتی ہے، نہ ہی کبھی حکمرانوں کے قربت کے لیے اپنی حسیت کو داؤں پر لگاتی ہے۔ ایک اقتباس ملاحظہ ہو۔

> بڑی سرکار ” کام کے بارے میں تمھیں اندازہ ہے کہ کیا کرنا ہوگا؟“
>
> ایمن ” میں ہر وہ کام کرنے کو تیار ہوں جو میری خودداری برداشت کرے۔“

(رفیعہ منظور الامین، عالم پناہ، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ دہلی 2012، ص:98)

ایمن کی اس خودداری میں رفیعہ منظور الامین نے خواتین کے ذریعے پیش کیے گئے ویمن امپاورمنٹ کو پیش کیا ہے۔ سماج میں اپنے وجود کو برقرار رکھنے کے لیے ایمن والدین کی موت کے بعد کسی پر بوجھ نہیں بننا چاہتی۔ جب کی مسز آئزاک اسے ہمیشہ اپنے گھر رکھنے کو تیار تھیں۔ لیکن اس کی عزت نفس نے یہ گوارہ نہ کیا۔ ایمن ناسازگار حالات میں بھی تمکنت اور ہوش کا دامن تھامے رہتی ہے۔ اس کی شخصیت میں تمام نسوانی صفات بھی موجود ہیں۔ ایک اقتباس درج ہے۔

> ”شمشاد اور میں مل کر (مہمانوں کا کھانا) نپٹالیں گے، آپ کیوں فکر کرتی ہیں۔ ایمن بولی۔“ ”یہ رہا ہمارا خانساماں۔ آج ایمن بی بی نے کھانا بنایا تھا۔“
>
> بڑی سرکار بیٹے سے بولیں۔“

مصنفہ نے ایک طرف ایمن کو خالص گھریلو لڑکی کی شکل میں اور امور خانہ داری سنبھالتے ہوئے دکھایا ہے تو دوسری طرف ملازمت پیشہ خاتون کے ہنر کو پیش کیا ہے۔ جس میں قدامت اور جدیدت کا امتزاج نظر آتا ہے۔ ایمن جدید دور کی لڑکی ہے اسے معلوم ہے کہ امور خانہ داری کا کام اس کی شخصیت کو مکمل کرنے میں معاون ہوگا، وہ ان لڑکیوں میں نہیں جو ماڑدن ازم کے نام پر اپنی شناخت اور اپنی ذمہ داریوں سے فرار حاصل کرنا چاہتی ہیں۔ اس نے ایک طرف بہترین میزبان کا فرض ادا کیا، ساتھ ہی اپنے حسن اخلاق سے بڑی سرکار کی قربت بھی حاصل کی۔

ایمن کی خود اعتمادی اسے زندگی کے مسائل کو حل کرنے میں معاون بنتی ہے۔ وہ محتاج بننے کی بجائے سماج کے لیے مفید بن کر پورے وقار کے ساتھ جیتی ہے۔ اپنے گرد و پیش کے ماحول کو اپنے موافق ڈھال لیتی ہے۔ یہ تمام خوبیاں ایمن کے اندر موجود ہیں۔ ایمن سماج میں رہتے ہوئے اپنے لیے جگہ بناتی ہے۔ وہ خود کی تنہائیوں اور مجبوری کا رونا رو کر اپنی کمزوری یا کم مائیگی کا احساس خود پر حاوی نہیں ہونے دیتی۔ ان صفات سے بڑی سردار یقینی طور پر خوش ہیں۔ ایمن میں بے انتہا اعتماد کی وجہ خود ایمن کا ثابت قدم رہنا، اپنے معاشی مسائل کو خود حل کرنا ہے۔ وہ محبت دے کر محبت وصول کرنا جانتی ہے۔ خود کفیل بننے کی چاہت میں اپنی عزت نفس کا سودا نہیں کرتی۔ ناموافق حالات میں وہ ایسا کر سکتی تھی مگر وہ انتہائی بدتر حالات میں اور تنہا ہوتے ہوئے بھی اپنی جدوجہد جاری رکھتی ہے اور پُر اعتمادی کے ساتھ حالات کا سامنا کرتی ہے۔

جب ’ فرمان‘ (حویلی) کو ہوٹل میں تبدیل کرنے کی بات چل رہی تھی۔ اس وقت ایمن آفس اسٹاف کی حیثیت سے آزر نواب کے ساتھ کام میں لگی تھی۔ جب ایک غیر ملکی آرکیٹکٹ نے غلط مشورہ دیا۔ جسے آزر نواب سمجھ نہیں پائے تو ایمن اپنا مشورہ دیتی ہے۔ ایمن کی سمجھ بوجھ اور اعلی تعلیم ہی اسے اپنے خیالات کا اظہار بڑے ہی سہل انداز میں پورے یقین کے ساتھ ظاہر کرنے کا ہنر عطا کرتی ہے۔ جس کا اعتراف آذر نواب کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ اس کی صلاحیت کی بنا پر اسے اونچے عہدے پر فائض کیا جاتا ہے، اس انداز میں تحکم نہیں ہے بلکہ ایک لطیف ملتجیانہ انداز ہے:

> ”ایمن۔ اس دریچے سے میں نے کئی بار اس طرف جھیل کے پار سورج کو غروب ہوتے دیکھا ہے۔“
>
> ”یہاں اس دریچے کو بند کرنے کے بجائے اسے مکمل دروازہ بنا دیا جائے۔ جس کے آگے کشادہ بالکونی ہو، تا کہ سورج کے غروب ہونے کا دلکش منظر ضائع نہ ہو۔“

(رفیعہ منظور الامین، عالم پناہ، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ دہلی 2012، ص168)

> کیوں نہیں۔ آزر نواب بڑی خوش اخلاقی سے بولے۔ وجہ یہ ہے کہ تم محض حویلی کی ایک جنرل اسسٹنٹ ہونے سے کہیں

> زیادہ قابل ہو۔ کل سے تمھیں اس ہوٹل کا سارا انتظام سونپا جا رہا ہے۔ اور تنخواہ میں بھی اضافہ کیا جا رہا ہے۔ بشرطیکہ یہ منظور ہو؟"

(رفیعہ منظورالامین، عالم پناہ، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ دہلی 2012، ص 186)

مذکورہ بالا اقتباسات سے ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ اتنے حساس کردار کا تعلق حقیقی زندگی سے ہے مصنفہ نے پوری ذمہ داری کے ساتھ اس کردار کے ذریعہ سے آزادیٔ نسواں کی بنیادی فکروں کا احاطہ کیا ہے۔

مصنفہ نے تسنیم پاشا کے ذریعے دو نسلوں کی عکاسی کی ہے۔ پہلی بٹی جو شباب کی عمر میں ہے۔ دوسری ماں کی حیثیت سے جو شباب کی عمر کے آخری حصے میں ہے۔ ان دونوں نسلوں کے درمیان مصنفہ نے بیوگی پر کاری ضرب لگائی ہے۔ بٹی شہانہ کو یتیم بنا کر تو تسنیم پاشا کو بیوہ کے روپ میں پیش کر کے۔ ان دونوں کی کسمپرسی کی زندگی پچھلی تاریخ کی گواہی دیتی ہیں۔ نوعمر لڑکی کا حسن مردانہ معاشرے کو اپنی طرف متوجہ کرتا ہے۔ جب کہ بیوہ ماں اس کے حسن کی حفاظت میں ماں باپ دونوں کا فریضہ انجام دیتی ہے۔ اس کے باوجود کھلتی ہوئی کلیوں پر گرہن کی شکل میں انھیں داغدار کرنے کے لیے مرد معاشرہ پوری طاقت آزماتا ہے۔ مصنفہ نے بے سہارا بیوہ کے جذبات، احساسات اور اس کی ممتا کو پوری طرح نکھارا ہے۔ ایک کو شعوری طور پر معصوم بنایا ہے۔ دوسری کو حالات سے مکمل طور پر واقف نہیں کرایا۔ پختہ عمر کی ہونے کے باوجود اپنی شبیہ کو بھول کر نوعمروں کی طرح جذبات کے دھارے میں بہہ کر اپنی مذہبی رواداری کو نظر انداز کر دیتی ہیں۔ بہ طور ثبوت اقتباس پیش ہے۔

> "ہال جگمگا رہا تھا۔ وہاں چھت کے لٹکے عظیم جھاڑ فانوس جو خاص خاص موقعوں پر استعمال کیے جاتے تھے۔ ایسا لگتا تھا جیسے ان سے لاکھوں جگنو لپٹ گئے ہوں۔ آنکھیں خیرہ ہو رہی تھیں۔ وہاں خاصی بڑی پارٹی کا انتظام تھا۔"

(رفیعہ منظورالامین، عالم پناہ، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ دہلی 2012، ص 186)

اس اقتباس سے معلوم ہوتا ہے کہ بیوگی کو جس طرح سے دوسرے ناولوں میں پیش کیا گیا ہے۔ تاریخ میں جس طرح کی بیوائیں ہمیں ملتی ہیں۔ اس کے برعکس تسنیم پاشا ان سے یکسر الگ ہیں۔ یہ کردار ماڈرن ازم کا ایک بہترین نمونہ ہے۔ مثلاً بیوہ ہونے کے باوجود اپنے ملبوسات کا رنگ ہلکا ہونے نہیں دیا۔ گھر میں مرد نہیں ہے۔ خادمہ سے خدمات لینے کے بجائے خود اپنی گھریلو ضروریات کی چیزیں خریدنے جاتی ہیں۔ اُس وقت وہ خود کو بے بس و تنہا نہیں سمجھتیں۔ وہ اپنی مرضی سے اپنی ضروریات کا انتخاب کرتی ہیں۔ خواہ رنگین لباس، صحت مند غذائیں، دوست واحباب کی محفلیں ہوں یا زندگی میں تفریح کے مقامات، ماحول، سجاوٹ، مہمانان اور اپنی زندگی کا خاتمہ ہی کیوں نہ ہو۔ ایک اقتباس پیش ہے۔

> " تسنیم پاشا کے بیڈروم کا دروازہ بھڑا ہوا تھا۔ جیسے ہی بڑی سرکار داخل ہوئیں، انھوں نے کلیجا تھام لیا۔ تسنیم پاشا گہری نیند سو رہی تھیں اور پاس ہی نیند کی گولیوں کی شیشی پڑی تھی۔"

(رفیعہ منظورالامین، عالم پناہ، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ دہلی 2012، ص 200)

بیواؤں کی طرح کسی کمرے کے ٹوٹی ہوئی چارپائی پر سکڑ کر زندگی گزارنے کے بجائے ہنسی خوشی زندگی جی رہی ہیں۔ جب کہ وہ ایک نوعمر بٹی اور جوان بیٹے کی ماں ہیں۔ بٹی کے لیے اگر وہ آزر نواب کو اپنا داماد بنانے کا من بنائے بیٹھی ہیں نیز خود کے لیے عقد ثانی کا ارادہ بھی رکھتی ہیں۔ وہ ازدواجی زندگی کے خواب بھی دیکھ رہی ہیں۔ جس کا عملی نمونہ مختار احمد کے ساتھ اپنے تعلقات کو مستحکم بنانے کی کوششیں ہیں۔ ان کے ساتھ، لنچ و ڈنر کا اہتمام کرنا، پارٹیاں کرنا، تفریح کے لیے اپنی اور ان کے پسند کے مقامات کا خیال رکھنا اور ایک دوسرے کو تحائف پیش کرنا وہ اپنی زندگی کی نصب العین بنا لیتی ہیں۔ اپنے معشوق کے ساتھ بیوی کی طرح مسکرانا، روٹھنا، منانا، ناراض ہونا، انتظار کرنا اور فرمائش کرنے کا انداز اپناتی ہیں۔ رفیعہ منظورالامین نے اس منظر کے ذریعے بیوہ کے وہ خوش گوار لمحات پیش کیے ہیں جو حقیقی زندگی سے پرے کر دیئے جاتے ہیں۔ چوں کہ معاشرہ نوعمر بچوں کی ماں کو معشوقہ یا بیوی کے روپ میں قبول نہیں کرتا ہے۔ عورت کے بھولے پن کا استحصال مرد معاشرہ مختار احمد کی شکل میں ہمیشہ سے کرتا رہا ہے۔ یہاں مختار احمد نے بیوہ کو اپنی کامیابی کے لیے سیڑھی بنایا۔ اس کی کامیابی کا حصول بیوہ کی بیٹی تھی۔ جس کا حسن و شباب پانا ان کا مقصد تھا۔ اس لیے مختار احمد تسنیم پاشا (بیوہ) کے جذبات سے کھیلتے رہے۔

جب مختار احمد کی حقیقت سامنے آتی ہے تو واضح ہوتا ہے کہ مرد کسی نہ کسی شکل میں عورت کا استحصال کرتا رہا ہے۔ اس موقع پر مختار احمد نے جذباتی استحصال کیا ہے جسے تسلیم پاشا برداشت نہیں کر پاتیں اور خودکشی کرتی ہیں لیکن ان کے گھر والے بروقت ان کی جان بچا لیتے ہیں۔ وہ نئی زندگی پا کر اپنی آرزوؤں پر افسوس کرتی ہیں۔ اس جذباتی ٹھیس کے بعد وہ پوری طرح بیوگی کی شکل اختیار کر لیتی ہیں۔ اب مصنفہ نے تسنیم پاشا کو روایتی بیوہ بنا دیا ہے۔ وہ خواہش کے باوجود بھی بیوگی کے پنجڑے سے باہر نہیں نکل سکتیں۔ یہی عورت کی تاریخ رہی ہے۔ آزادیٔ نسواں کے نعرے کے باوجود اس بیوہ کو آزادانہ زندگی جینے کا حق نہیں ملا۔ مردوں نے

معاشرے میں بیوہ کے متعلق نفسیاتی فریمنگ اس طرح کی ہے، گویا بیوہ ہو تو اس کا مقام بیوہ کا ہی ہوتا ہے عورت کا نہیں۔

مصنفہ نے بیوہ کو استعارہ بنا کر معاشرے کی سخت مزاجی کو بدلنے کے اشارے کیے ہیں۔ کیا بیوی کی موت کے بعد مرد اپنی زندگی کی شروعات دوبارہ کرنا چاہے تو انھیں آزادی نہیں ہے؟ کیوں مردوں کو کثرت ازدواج میں منتقل ہونے کے باوجود کوئی عیب نہیں سمجھا جاتا؟ کیوں کسی بھی عمر میں مرد عقد ثانی کا اہل ہوتا ہے؟ کیوں مشرقی تہذیب میں مرد و زن کے لیے الگ الگ خانیں بنائے ہیں؟ یہ ایسے سوالات ہیں جن کے جوابات معاشرے سے طلب کیے جا رہی ہیں۔

رفیعہ منظور الامین نے خواتین کے متعلق ایک بہت ہی اہم نکتے کو پیش کیا ہے۔ صدیوں سے عورت مرد معاشرے میں خرید و فروخت کی چیز رہی ہے۔ اس ناول میں شمشاد جو کہ بڑی سرکار کی نور نظر ہے۔ اسے اس کے والدین نے ہی بیچ دیا تھا اور زمرد محل نے اسے خرید کر بہ طور عورت جینے کا حق دیا ہے۔ یہاں بہ طور ثبوت اقتباس شمشاد کی زبانی پیش ہے:

”اوئی جھاڑو پھیر وان لو۔ بیچ کر کھائے سو میرے کو۔ شمشاد کا لہجہ تلخ ہو گیا۔... ایمن، مگر تم بھول رہی ہو شمشاد۔ ہو سکتا ہے انھوں نے اپنے پیٹ کی خاطر نہیں۔ تمھیں تمہاری زندگی کی خاطر بیچا ہو۔“

خود مصنفہ اس پر فرماتی ہیں۔” ان محسوسات کے باوجود
.... کہاں ایسی مثالیں ملتی ہیں جہاں رہا ہونے پر بھی
قیدیوں نے قید خانہ چھوڑنے سے انکار کر دیا تھا۔“

(رفیعہ منظور الامین، عالم پناہ، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ دہلی 2012، ص: 171)

رفیعہ منظور الامین نے بیگم زمرد محل (بڑی سرکار) کے کردار کا انتخاب تاریخ کی روشنی میں کیا ہے۔ ان کے نام سے ہی واضح ہے کہ انھیں صفت سے زیادہ لقب دیا گیا ہے۔ جس کا اندازہ قدیم ادب کے مطالعہ سے یا خواتین کی تاریخ کی روشنی کے ذریعہ معلوم ہوتا ہے۔ جس طرح شاعری کی ابتدا میں قلی قطب شاہ نے اپنی پیاریوں کے القاب بھی محل کے نام سے درج کیے تھے۔ اسی طرح مسلم خواتین میں بھی محل کے نام سے حضرت محل اور زینت محل وغیرہ کے کردار قائم کیے گئے ہیں۔ جو اس وقت کا چلن تھا۔ اسی سلسلے کو مصنفہ نے برقرار رکھا جب کہ خواتین دہے کی تبدیلی میں بہتر نام کی روایت عام ہو چکی ہے۔ کیوں کہ خواتین اپنے شوہر، والد یا بھائی کے نام سے جانی جاتی تھیں۔ مثلاً ٹامسن مائکل، جیمسن ہلیری وغیرہ۔ یہ مردوں کے نام کے ساتھ اپنی پہچان بناتی تھیں۔ یہاں پر مصنفہ جدید رجحان تحریک نسواں سے صرف نظر کرتی ہیں۔ کیونکہ بہترین ناموں سے بہتر شناخت بنانے میں آسانی ہوتی ہے۔

مصنفہ نے نام سے ہی کردار سے جڑا واقعہ منظر عام پر پیش کیا ہے۔ اسے انھوں نے نام میں ہی پنہاں رکھا ہے۔ جیسے زمرد محل (بڑی سرکار) معیار کا ہی ایک استعارہ ہے۔ لفظ محل کا آنا ہی شخصیت کی بالائی سطح کا اندازہ کراتی ہے۔ اس پر اگر زمرد کا استعمال ہو تو وہ اس بات کی نشاندہی کرتا ہے کہ اس کی اہمیت کیا ہے۔ ہمیں معلوم ہے کہ زمرد ایک خاص قسم کے قیمتی پتھر کا نام ہے جو اپنی خصوصیت کی بنا پر مختلف طرح سے انگوٹھی و خواتین کے زیورات میں نقش کیے جاتے ہیں۔ تحائف میں امیر و رئیس خاندانوں میں اس کا خوب چلن رہا ہے۔

بڑی سرکار نے جس طرح اپنی نجی زندگی کو پوشیدہ رکھا ہے نیز اپنے اندر چھپی ہوئی عورت پر بھی خول چڑھا رکھا ہے۔ ایسا وہ عورت ہی کر سکتی ہے جسے اپنے جذبات و احساسات پر مکمل اختیار حاصل ہو۔ جو دوہری زندگی جینے کا ہنر جانتی ہو۔ انھوں نے بیوگی کو اپنی صلاحیتوں پر غالب ہونے نہیں دیا۔ وہ جس طرح سے دوسری خواتین کی مدد کرتی ہیں ان کے دکھ درد کی ساتھی بنتی ہیں۔ خواتین کے ساتھ ان کا مشفقانہ رویہ ہے۔ اپنے اندر کی صلاحیتوں کو اپنے فہم و ادراک سے نہ صرف جانچتی ہیں بلکہ دوسروں کے لیے ایک بہترین نمونہ بن کر ابھرنے کی کوشش کرتی ہیں۔ مصنفہ نے مکمل ناول میں اس کردار کو معتبر رکھ رکھاؤ کے ساتھ پیش کیا ہے جب کہ وہ خود نامساعد حالات کی شکار ہیں یعنی بیوگی کی۔ جس طرح اس ناول میں دوسری بیوہ ہے۔ اس سے منفرد اس بیوہ کا کردار ہے۔ جیسے وہ اپنی ازدواجی زندگی کے مشکل ترین حالات کو بڑے ہی سہل انداز میں کہانی کی شکل میں ایمن کی مدد سے رقم کرواتی ہیں۔ پورے خاندان 'فرمان' کا نظم ان کے زیر نگرانی پروان چڑھتا ہے۔ سوتیلے رشتوں کو سگے رشتوں کی طرح مان دیتی ہیں۔ یہاں تک کہ کسی فرد کو کبھی یہ احساس ہی نہیں ہوا کہ وہ الگ الگ والدین کی اولادیں ہیں۔

بڑی سرکار اپنی ازدواجی زندگی کے مسائل، جابر شوہر کی زیادتیوں، بدگمانیوں، ظلم و ستم اور نااعتباری کے باوجود بڑی فنی چابکدستی کے ساتھ ناول کو بہتر شکل دینے میں کامیاب رہتی ہیں۔ مصنفہ نے اس کردار کے ذریعے خواتین کے چار اہم مسائل کی پیش کشی کی ہے۔ بلکہ ان چاروں مسائل کا سدِ باب بھی بڑی سرکار کی زبانی ہی پیش کرتی ہیں۔

”آزر نواب کو بزنس کے ضروری کام کے سلسلے میں جرمنی جانا پڑا ہے۔... لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ تم بھوکے رہو گے۔ تم سب فوراً کام پر چلے آؤ۔.... خدا نے مجھے اتنا

> دیا ہے کہ اپنے بچوں کو کچھ دن بٹھا کر بھی کھلا سکتی ہوں۔ نئی مشینیں آنے سے فیکٹری میں پہلے سے بھی زیادہ کام بڑھ جائے گا۔“

(رفیعہ منظور الامین، عالم پناہ، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ دہلی، 2012، ص:202)

بڑی سرکار بیوہ ہونے کے بعد پست، سُست، مجہول زندگی نہیں گزارتیں۔ وہ خود کفیل ہیں اور دوسروں کی کفالت کا جذبہ بھی رکھتی ہیں اور کرتی بھی ہیں۔ مصنفہ نے زمرد محل کو بڑی سرکار کی حیثیت سے بہتر کردار نگاری کے ساتھ پیش کیا ہے۔ جس طرح الطاف حسین حالی نے مناجات بیوہ میں بیوہ کے کردار کو فوقیت دی تھی۔ اس کے اثرات معاشرے پر اس قدر ہوئے تھے کہ سہاگن خواتین خود کو بیوگی میں پسند کرنے لگی تھیں۔ اسی کا ایک نمونہ رفیعہ منظور الامین نے بیان کیا ہے:

بڑی سرکار اپنے لقب ’بڑی سرکار‘ کے تحت اسی کردار کی مالکہ ہیں۔ جس طرح سے وہ اپنے خدو خال کا خیال رکھتی ہیں، اسی طرح سے اپنی ماتحت خواتین کا بھی خیال رکھتی ہیں۔ ان میں دو ملازماؤں ایمن (پرسنل اسسٹنٹ) اور شمشاد پر خاص کرم فرماتی ہیں۔ خواہ عیادت کے لیے جانا ہو یا مالی تعاون کی ضرورت ہو یا شادی کی تقریب ہو۔ بڑی فیاضی کا مظاہرہ ہوتا ہے۔

وہ اپنی محکوم خواتین کو ملازمہ کی حیثیت سے کم، جانشین کی طرح ہمراز رکھتی ہیں۔ وہ جتنا ان پر اعتماد کرتی ہیں، اتنی ہی ان کی کرم فرما بھی ہیں۔ اسی لیے ایمن بڑی سرکار کی پرسنل اسسٹنٹ ہونے کے باوجود انھیں اپنی رائے دینے کی ہمت رکھتی ہے۔ اپنائیت اس معاشرے کی دین ہے۔ بڑی سرکار کے خانوادے یا ملازمین کو ’فرمان‘ میں کشادہ ماحول اور تحفظ دونوں ملتا ہے۔ جس کی طلب گار خواتین بھی ہیں۔ جیسے ملازمت میں مساوات یا خاندان کے حقوق میں مساوات۔ اس طرح سے بڑی سرکار اپنے ماتحت خواتین کے حقوق کی ادائیگی میں کھری اترتی ہیں۔ بعض دفعہ دوران مطالعہ گمان ہوتا ہے کہ بڑی سرکار کے کردار میں قائدانہ صلاحیتیں بھی بدرجۂ اتم موجود ہیں۔ وہ جس انداز میں معاملات کو سنبھالتی ہیں اس سے ان صلاحیت کا مظاہرہ ہوتا ہے۔ جسے ویمن امپاورمنٹ کی مثال کہہ سکتے ہیں۔

بڑی سرکار کی قوت ارادی اور فیصلہ سازی پر تفصیلی وضاحت ہو چکی ہے۔ یہاں ان کی خاندان میں مرکزیت کے لحاظ سے دو باتیں موزوں کی مناسبت سے ضروری ہیں۔ زمرد محل یہ ایک طرح سے مدرسری نظام Main Stream کی Opposite ہیں۔ زمرد محل نہ صرف پورے ناول میں مرکزی حیثیت رکھتی ہیں۔ قصے کے اعتبار سے بھی دیگر نسوانی کرداروں پر وہ کبھی محکوم بن کر پوری شدت کے ساتھ ظاہر ہوتی ہیں۔ کبھی مشفق و مربی بن کر، کبھی دوست بن کر، کبھی بڑی بہن بن کر اور کبھی سرپرست کی حیثیت سے ہمیشہ منظر عام پر نظر آتی ہیں۔

مکمل ناول میں Main Stream پر نظر آتی ہیں۔ یہ رفیعہ منظور الامین کا کمال ہے کہ کہانی میں مرد و خواتین کے ذریعے سے آگے بڑھتی ہے لیکن مرکزی حیثیت نسوانی کرداروں کو ہی دی گئی ہے۔

مصنفہ نے دو طرح کے کردار پیش کیے ہیں۔ ایک مرد، دوسرا عورت کا کردار۔ مرد اور خواتین کردار دونوں باہمت ہیں لیکن مرد کرداروں میں اعتدال باقی نہیں رہتا۔ خواتین کرداروں نے اپنے توازن کو برقرار رکھا ہے۔ زندگی کے میزان میں جہاں کہیں بھی اتار چڑھاؤ آتے ہیں۔ وہاں وہ قوت ارادی کے ساتھ اس کا مقابلہ کرتی ہیں۔ طبعی اعتبار سے مردوں سے کمزور ہونے کے باوجود اس ناول کے کردار بے حد مضبوط ہیں۔ اسی لیے وہ غلامی میں ہوں یا آزاد ہوں، محلوں کی سرکار بنی ہوں یا محکومی کی زندگی گزار رہی ہوں، بیوگی کی حالت ہو یا خود کفیل ہوں۔ تمام حالات کا سامنا اپنی طاقت سے زیادہ قوت ارادی سے کرتی ہیں۔ تانیثیت کی مانگ ہے کہ عورت کو بہ حیثیت عورت زندگی باوقار طریقے سے جینے کا حق دیا جائے۔ مصنفہ نے ناول میں ایمن کے ذریعہ اس مانگ کو پورا کیا ہے۔ عورت بیوہ ہو یا شادی شدہ اسے اپنی مرضی سے سماج میں رہنے کا حق حاصل ہے۔ اسے دوبارہ اپنی پسند سے شادی کرنے کا حق ہے۔ حصول تعلیم کے ساتھ ساتھ معاشی تگ و دَو کا بھی حق رکھتی ہے۔ مجموعی طور سے کہانی میں رفیعہ منظور الامین نے ویمن امپاورمنٹ کو پیش کرنے کی بہترین سعی کی ہے۔

یہ ناول کی خصوصیات ہیں جس طرح سے نسوانی کرداروں کو رفیعہ منظور الامین نے باہمت پیش کیا ہے اسی طرح خواتین اتنی ہی باوقار بھی ہیں۔ ان کرداروں میں گھٹیا پن یا غیر اخلاقیت کا مظاہرہ نہیں ہوتا۔ بعض مقامات پر ماڈرن ازم کا تصور بھی پیش کیا گیا ہے۔ مذکورہ اقتباسات کی روشنی میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ ناول کا پلاٹ سپاٹ، سادہ اور سلیس ہے۔ کہیں کہیں فنی اعتبار سے کمزوریاں ہونے کے باوجود ناول کا پلاٹ پختہ ہے۔

□□□

Dr. Naaz Aafreen
Opp. Jama Masjid
Bariatu
Ranchi-834009 (Jharkhand)

فہمینہ علی

شاعری میں اظہار کے امتیازات

میں زندگی کی کتاب میں اک فسانہ بے اثر نہیں تھی
ورق کو جلدی الٹ گئے تم میں 'قصہ مختصر' نہیں تھی

(نصرت مہدی)

انسانی زندگی کی کتاب میں اکثر و بیشتر عورت کے باب کو پلٹنے میں جلد بازی سے کام لیا ہے ہالانکہ عورت کا قصہ کبھی اتنا مختصر رہا بھی نہیں کہ اسے ایک ورق میں سمیٹا جا سکے۔ انسانی تاریخ کی جانب غور سے دیکھیں تو وہ مردانہ نعرے بازیوں اور جملوں کے شور شرابے سے بھری نظر آتی ہے لیکن عورت اس صدیوں کے سفر میں خاموشی سے مسکراتے ہوئے اسے بس دیکھ رہی ہے یہ مسکراہٹ ایک ''کوڈ'' ایک پہیلی کی مانند اتنی پر اسرار اور خاموش ہے جسے آج تک کوئی حل نہ کر سکا اس کے حل کرنے میں ایک دشواری یہ بھی ہے کہ مرد کو علم ہی نہیں کہ ایک عورت کی مسکراہٹ کے پس منظر میں کتنی محبتوں کی مٹھاس اور کتنی نفرتوں کی تلخی پوشیدہ ہے۔ ہماری شعری روایت میں مرد ہمیشہ عاشق بن کر سامنے آیا ہے قدیم شعری روایت میں مرد نے خود کو عاشق ثابت کرنے کی بھرپور کوشش کی ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ مرد کو عورت جیسا عشق کرنا نہیں آ سکا کیونکہ عشق کرنا صرف اور صرف عورت کا کام ہے عورت نے ہمیشہ ہی سب سے بہترین عشق کیا ہے۔ اسے مرد کی ضد سے مجبور ہو کر معشوق بننا پڑا ہے وگرنہ عورت تو ہمیشہ سے ہی عاشق ہے اس بات کی وضاحت میں 'لطیف' نے کہا ہے کہ ''محبت میں میری مرشد عورت ہے۔'' مرد کو جب جب اپنی شاعری میں اظہار کی ضرورت پیش آئی انھیں بھی عورت ہی بننا پڑا ہے اردو کی قدیم شاعری ایسی مثالوں سے بھری پڑی ہے۔ جبکہ عشق کے اظہار میں عورت نے مرد سے بہترین کردار نبھایا ہے اس کی بنیادی وجہ یہ بھی ہے کہ عورت نے ازل سے عشق کو صرف جیا نہیں ہے بلکہ وہ عشق میں خود ''عشق'' ہو گئی ہے اور اس کے اظہار سے زیادہ اس کے عملی انداز کو نبھاتی بھی نظر آتی ہے عورت کے دل نے ہمیشہ ہی شاعرانہ وصف اور جذبات کی گرماہٹ کو اوروں سے زیادہ ہی محسوس کیا ہے۔ بقول ورجینا وولف Virginia Woolf:

''کون اس شاعرانہ دل کی تپش اور تشدد کی پیائش کر سکتا ہے
جو ایک نسواں جسم میں مقید اور محصور ہے۔''

عورت کے شعری اظہار کی لیاقت اور استعداد کی تفہیم ناممکن ہے لیکن تاریخ اس بات کی گواہ ہے کہ سبھی عہد اور سبھی زبانوں اور تہذیبوں میں خواتین کے کارناموں کی قدر متعین کرنے کی حد بھر کوششیں ہوئی ہیں اب بھلے ہی ان کے حصے میں ویسی کامیابی نہیں آئی جیسی کامیابی کی وہ مستحق تھیں لیکن ان کاوشوں سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ تانیثیت کی اولین علمبردار جان اسٹورٹ مل نے اپنی تصنیف On The Subjection Of Women میں قدیم زمانے کی عورتوں کے تخلیقی اظہار کی صلاحیتوں کے متعلق لکھا ہے:

> ”جس مضمون میں ان کو موقع ملتا آیا ادبیات (نظم ونثر دونوں) میں کوئی انعام ایسا نہیں تھا جو انھوں نے نہ لیا ہو، اور کوئی داد نہ تھی جو انھیں ملی نہ ہو۔ زمانہ قدیم میں جب عورتوں کو شاذ ہی کسی فن میں حصہ لینے کا موقع ملتا تھا۔ ایسی قابل قدر عورتیں گزری ہیں کہ اس زمانے کا رنگ دیکھتے ہوئے حیرت ہوتی ہے۔ یونانیوں کے بڑے شعراء میں سیفو کا نام لیا جاتا ہے ، جو ایک عورت تھی اور اسی طرح میرتس بھی جو اس زمانے کے بڑے بڑے شعراء کے مقابلے میں بازی لے گئی۔ اسفیزہ ایک فلسفی تھی ، جس نے تصانیف نہیں چھوڑیں لیکن وہ تھی جس نے شعرا کو درس دیا۔

(بحوالہ: محکومیت نسواں: ترجمہ، مولوی معین الدین انصاری، ص98، مکتبہ جامعہ، نئی دہلی)

اردو شاعری کی 500 سالہ قدیم روایت میں عورت ہمیشہ مرکزی شکل میں رقم کی گئی ہے۔ اکثر وبیشتر شعرا نے اس کے حسن وجمال سے اپنے کلام کی آرائش وزیبائش کا کام لیا ہے۔ عورت سے ہی اپنے تمام تر جذبات وابستہ کر کے مرد شعرا نے بڑے بڑے دیوان مرتب کر دیے۔ لیکن افسوس ہے اس قدیم تاریخی شعری نظام میں عورت کی کیفیات کا اظہار ہمیشہ مفقود رہا۔ اس ضمن میں قاضی افضال حسین اپنے مضمون میں لکھتے ہیں:

> ”شاعری کی تقریباً دوسو سالہ کلاسیکی روایت میں عورت کہیں بھی بولتی ہوئی سنائی نہیں دیتی ۔تخلیق رتعمیر کا یہ مرد اساس عرصہ(space)اس حد تک وسیع ہو گیا ہے کہ عورت کے جذبات واحساسات کا مضمون اس شاعری کے محیط پر بھی نظر نہیں آتا۔ معشوق کی کیفیات کا مضمون تو ہماری کلاسیکی شاعری میں شاذ ہی ہے۔ اس کی گفتگو اور عمل سے متعلق ہماری تمام اطلاعات شاعررمرد کی مرہون منت ہیں۔ جو اس عورت کو اپنی شعری روایت کے حوالے سے دیکھتا اور بیان کرتا ہے۔
>
> دنیا کی اکثر شاعری کی طرح اردو میں بھی بقول سلویا پلاتھ وہی آواز ہے جس نے ہمارے متعلق بات کی ، ہم سے بات کی، ہم پر بات کی لیکن یہ آواز کچھ ہمارے لیے نہیں اٹھی۔“

(متن کی تانیثی قرآت، ص75، مشمولہ بیسویں صدی میں خواتین اردو ادب 2002، نئی دہلی)

اس مضمون میں قاضی افضال حسین نے اردو شاعری کی دوسو سالہ تاریخ کا جائزہ پیش کیا ہے جس میں کلاسیکی شعری امتیازارت کے حوالے سے انھوں نے سلویا پلاتھ (مشہور مغربی مصنفہ) سے منسلک یہ مثال پیش کرتے ہوئے تخلیقی نظام میں عورت کی نظراندازی کی بابت تفصیل سے بحث کی ہے۔ غور سے دیکھا جائے تو یہ بات قابل توجہ بھی ہے اور فکر کی متقاضی بھی کہ عورت کو تاریخ انسان میں وہ مقام کبھی نہیں دیا گیا جس کی وہ مستحق ہے۔

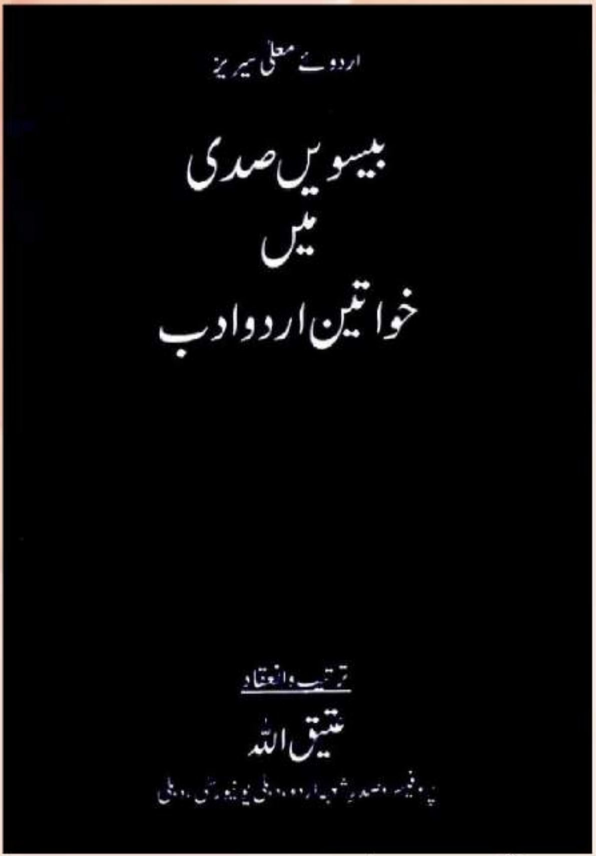

اردوئے معلی سیریز

بیسویں صدی
میں
خواتین اردو ادب

ترتیب وانتقاد

عتیق اللہ

دیگر مغربی رجحانات کی مانند تانیثیت "Feminism" کے رجحان کی جڑیں بھی مغربی تہذیب سے وابستہ ہیں ۔ یہ تحریک دراصل جنسی مساوات کی حامی ہے اور معاشرتی نظام کے خلاف آواز بلند کرتی ہے جس معاشرے میں مرد عورت کو محض سامان عیش وعشرت وتجارت تسلیم کیا کرتے ہیں۔ یہ تحریک ان تمام معاشرتی اصولوں سے بھی اتفاق نہیں رکھتی جو پدرانہ نظام کے تعمیر کردہ ہیں جہاں مرد کو ہمیشہ ہی مرکزی حیثیت حاصل رہی ہے اور عورت کو دوسرے درجے کی مخلوق سمجھا جاتا رہا ہے جہاں وہ اپنی خواہشات وحسرتوں وتمناؤں کے لیے مرد کی مرہون منت ہے۔ اس کی بنیادی وجہ ہمارا معاشرتی نظام ہے جس نے عورت ومرد کی جو صفات متعین کی ہیں ۔ وہ زندگی کے تمام شعبوں میں مرد کی بالادستی کا احساس کراتی ہیں ۔ چونکہ ان صفات کے متعین کرنے میں خود مرد کا ہی ہاتھ ہے جس میں عورت کا کوئی دخل نہیں ہے جس کی وجہ سے مرد ہمیشہ عاقل کامل منتظم اور قوی

تسلیم کیا جاتا ہے اور عورت کمزور کم عقل منت کش اور جذباتی قرار دی جاتی ہے تانیثیت کی تحریک اس معاشرتی تفریق سے اتفاق نہیں رکھتی۔ اس کی نظر میں قدرت کی بنائی ان مختلف صفات پر تو ہے لیکن وہ ان صفات کے طاقت ور یا کمزور پہلو کو اپنے نقطہ نظر سے دیکھنے میں یقین رکھتی ہے۔ اس کے نزدیک صفات و اوصاف کی تفریق فطری نہیں بلکہ ہماری تہذیبی ضرورتوں کی زائیدہ ہے۔ اس سلسلے میں قاضی افضال حسین رقم طراز ہیں:

> ”علم الحیوانات کے مطابق تو فطرت کی صرف وہ سات خصوصیات ہیں جو ہر ذی حیات میں مشترکہ ہیں۔ حرکت ،نشونما، سانس ،تولید، اخراج ،فضلہ یہ جاندار کو غیر جاندار سے الگ کرتی ہیں۔ ان مشترک فطری صفات پر کسی نوع یا جنس کے لیے کسی نئ صفت کا اجافہ اس معاشرتی اور تہذیبی ضرورتوں سے قائم ہوگا۔ چنانچہ یہ مرد سے منسوب بہادری یا عورت سے متعلق ”توہم“ صرف و محض ہماری معاشرتی اور تہذیبی زندگی کے نتائج ہیں۔“

(متن کی تانیثی قرآت ،ص 75 ،مشمولہ بیسویں صدی میں خواتین اردو ادب 2002 ،نئ دہلی)

تانیثیت کے علمبردار عورتوں کے حقوق کے لیے 19 ویں صدی میں سرگرم عمل ہوئے جب اس آواز نے باقاعدہ تحریک کی صورت اختیار کی جس سے منسلک صرف خواتین ہی نہیں بلکہ مرد ادیب و شاعر صحافی فنکار بھی شامل ہوئے۔ جن کی مشترکہ کاوشوں سے 1882 میں "Married Women's Property Act" کے پاس ہونے کے بعد خواتین کو ذاتی ملکیت خرید و فروخت کا خصوصی حق حاصل ہوا۔ خواتین کو سماج میں مساوی حقوق میں ملنے والا یہ حق اولین تھا۔ اس کے بعد 1960 میں اس تحریک نے شدت اختیار کی اور خواتین کو سماج میں اقتصادی اور سیاسی برابری دلانے کی کوششوں میں تیزی آئی جس کے نتیجے میں 1975 میں اس جنسی تفریقات کو غیر قانونی قرار دیا گیا جو خواتین کی آزادی اور ترقی میں حائل تھیں۔ ساتھ ہی اس بات کا اعتراف بھی ہوا کہ جس طرح اس کائنات میں دوسری تمام چیزیں بنا کسی تفریق کے اپنی صفات کے حوالے سے قبول کی جاتی ہیں اسی طرح معاشرے کے دو اہم رکن مرد اور عورت میں عورت کو دی ہوئی صفات میں کسی قسم کی تخصیص جائز نہیں ہے۔ جس طرح مرد اپنی شخصیت کی تشکیل کے لیے مکمل طور پر ہر معاملے میں آزاد ہے اسی طرح عورت بھی اپنی ذات کے تشخص کے لیے اخلاقی، تہذیبی، سماجی اور معاشی طور پر خود مختار ہے۔

اردو کی کلاسیکی شاعری کے مطالعے سے یہ بات واضح طور پر سامنے آتی ہے کہ دوسری زبانوں کی شاعری کی مانند اردو شاعری میں بھی عورت محبوب کی جو صفات بیان کی گئی ہیں وہ اس دور کے مردوں کے عورتوں کی جانب ان کے نظریے کو واضح کرنے کے ساتھ ساتھ جنسی آسودگی کا ایک ذریعہ بھی نظر آتے ہیں۔ اس سلسلے میں صفاتی نظام کے متعلق بات کریں تو عورت کے لیے ظالم، کافر، قاتل، غافل، بے وفا سنگ دل وغیرہ جیسے الفاظ استعمال کیے جاتے رہے ہیں جبکہ مرد کے لیے کوئی بھی ایسے القاب نہیں ہیں گویا اسے یہاں بھی وہی برتری حاصل ہے جو اسے حقیقی زندگی میں حاصل ہے اسے کبھی بھی بے وفا ظالم یا کافر جیسے ناموں سے نہیں پکارا گیا بلکہ اسے ہمیشہ ہی باوفا تسلیم کیا گیا اور اس کے یہی جذبات و احساسات غزل کے عمدہ مضامین ہوتے تھے۔ غزل میں معشوق کی خوبصورتی اور صفات کے ساتھ ساتھ ہی عاشق کی کیفیت کا ذکر بھی کیا جاتا رہا ہے جس سے اکثر و بیشتر اوقات کلاسیکی شاعری میں محبوب عورت کے جذبات کی عکاسی زیادہ تر مفقود ہی نظر آتی ہے۔ اردو کی شعری روایت میں اظہار کی اس طرز کے لوگ اتنے عادی ہو چکے ہیں کہ جب بھی عورت شاعری میں کوئی بات کہتی ہے تو وہ بھی اسی روایتی طرز اظہار اور اس کو لوازمات کو ہی وسیلہ اظہار بناتی ہے یعنی کہ شاعری میں وہ خود کو عاشق نہیں معشوق ہی برتتی ہے اور اپنی عشقیہ کیفیت کے اظہار کو شاعری کا موضوع بناتی ہے۔ اردو کی قدیم شاعری سے متعلق ماہ لقا بائی کے یہ اشعار دیکھیں:

گل کے ہونے کی توقع میں جیے بیٹھی ہے
ہر کلی جان کو مٹھی میں لیے بیٹھی ہے

ہم سے کرے ہے یار بیاں اپنی چاہ کا
حاضر ہیں ہم بھی ہو اگر وعدہ نباہ کا

چونکہ کلاسیکی شاعری خالص روایتی شاعری تھی اور اپنے اصول و نظریات کی پابند بھی تھی اس وجہ سے بھی وہاں مرد حضرات تو اپنے جذبات کا اظہار قدر بیباک انداز میں کرتے نظر آتے ہیں لیکن عورت کے یہاں اس سے متعلق جذبات کا اظہار تقسیم کے بعد سے اردو شعر و ادب میں عام ہونا شروع ہوا۔ تقسیم کے بعد شاعرات کے کلام کا جائزہ لیں تو احساس ہوتا ہے کہ بعض شاعرات کے یہاں اظہار کی نوعیت قدیم دور سے مختلف ہے جس کے نتیجے میں وہ اپنے ذاتی یعنی نسائی تجربات و کیفیات کو اپنے کلام میں پیش کرتی ہیں۔ عمومی طور پر دیکھا جائے تو تقسیم کے بعد کی شاعرات نے اپنے غزلیہ کلام میں مروجہ مضامین کو ہی برتا ہے لیکن اس میں بعض

شاعرات کے یہاں روایت اور قدیم اصولوں سے ایک انحرافی رویہ بھی نظر آتا ہے جو تبدیلی کا واضح انداز و ثبوت ہے۔ اس دور کی شاعرات خود کو ایک دوشیزہ، محبوب، ماں کے طور پر برتتی نظر آتی ہیں۔ بعض شاعرات نے جنس کی بنیاد پر معاشرتی تفریق کی بنا پر ایک لڑکی کی زندگی میں پیش آنے والے حالات و تجربات کو واقعاتی طور پر نظم کیا ہے دراصل جس تفریقی نظام کے تحت عورت زندگی کے مراحل طے کرتی ہے اس میں اس کا اپنا نہ کوئی گھر ہوتا ہے اور نہ اپنے حقوق۔ وہ ہمیشہ دوسروں ریا مردوں کی زیر نگرانی ہی زندگی گزارتی ہے۔ بچپن میں باپ بھائی اور پھر شوہر کے ساتھ اس کی زندگی کا سفر طے ہوتا ہے لیکن ان سبھی انسانی رشتوں کے درمیان کہیں بھی اسے اس کے اصل حقوق جو دراصل اس کی ذات سے وابستہ ہیں نہیں مل پاتے بلکہ اسے صرف اس کے فرائض کی یاد دہانی ہی کرائی جاتی ہے۔ یہ دشواریاں اصل روپ میں عورت کی شادی شدہ زندگی ے وابستہ مسائل کی شکل میں نمودار ہوتی ہیں۔ کشور ناہید کی یہ نظم 'نیلام گھر' دیکھئے:

وہ نفرتوں کے بوسوں کا رنگ دے کر رمرے منہ پر نیلے
نیلے داغ ڈال کر ریہ جتانا چاہتا ہے رکہ اسے میرے جسم کو
ہر طرح استعمال کرنے کا حق ہے ریہ حق بھی کیا عجیب
ہوتا ہے رحق جتانے کی خواہش رہر کذب و ریاکاری کو
صدقے ہوئی رمحبتوں کا نقاب اڑھاتی ہے رمگر نقاب
سے نیچے سے چہرہ راب تو اور بھی صاف اور واضح نظر آتا
ہے رترغیب و تذلیل یکجا ہو کر زوج بنتے ہیں۔

مرد معاشرتی نظام میں بعض شاعرات نے اس طرح کے اظہار کی جرأت بھی کی ہے جسے اس معاشرے میں معیوب گردانہ جاتا تھا۔ انھوں نے جنسی تجربات کو بلا تکلف و بے حجاب لیکن حقیقی انداز سے اپنی شاعری میں برتنا شروع کیا اس سلسلے میں فہمیدہ ریاض کی نظم 'زبانوں کا بوسہ' کے چند مصرعے دیکھیں جس میں عورت کی شخصیت کے اہم پہلوؤں پر روشنی ڈالی گئی ہے:

زبانوں کے رس میں یہ کیسی مہک ہے ریہ بوسہ کہ جس سے
محبت کے صہبا کی اڑتی ہے خوشبو ریہ بدمست خوشبو جو گہرا
غنودہ نشہ لا رہی ریہ کیسا نشہ ہے۔ (زبانوں کا بوسہ)

نسائی جذبات کی ترجمانی میں عورت جہاں بیٹی ہے بیوی ہے وہیں وہ اپنی زندگی کے مراحل میں فیض یابی ماں بن کر حاصل کرتی ہے اردو شاعری میں ممتا کے جذبات کو نظم کرنے کی روایت ادا جعفری نے بخوبی قائم کی۔ اسی سلسلے کو فہمیدہ ریاض نے اپنی نظم 'لاؤ اپنا ہاتھ لاؤ ذرگ' میں بڑھایا ہے جس میں انھوں نے ماں بننے کے تجربات کو قلم بند کیا ہے اور اسی موضوع پر پروین شاکر کی نظم 'دودھ شہر اور شبنم' میں نہایت خوبصورت انداز میں برتا ہے۔

غزل کی روایت میں اردو شاعرات کی بابت ذکر کریں تو روایتی دور میں جو شاعری منظر عام پر آئی اس کا ذکر ہم کر ہی چکے ہیں لیکن تقسیم کے بعد کی غزل کے حوالے سے دیکھا جائے تو ان خواتین شعرا نے اردو غزل میں ادا جعفری سے لے کر شہناز نبی تک غزل کی شعری روایت سے انحراف کا رویہ اپنایا تو ہے لیکن وہ احتجاجی اور استفادی اپنے اپنے حالات کے حساب سے۔ اس کے علاوہ انھوں نے اس روایت میں بعض ایسی صفات پیدا کی ہیں جو انھیں مرد معاصرین سے مختلف و منفرد بناتی ہیں۔

شاعری میں خصوصی طور پر غزلیہ شاعرات کے اظہار کے امتیازات میں ایک اہم خصوصیت ان روایتی کرداروں کی غیر موجودگی بھی ہے جو کلاسیکی غزل کا اہم حصہ ہوا کرتے تھے مثلاً ناصح، زاہد، شیخ، طبیب، نامہ بر، قاصد یا رقیب جیسے کردار بھی شاعرات کے یہاں نہیں ہیں۔ ان کی غیر موجودگی اس بات کو صاف ظاہر کرتی ہے کہ عورت کے یہاں عشق و عاشقی کے معاملات خالص ذاتی ہیں اور وہ انھیں اپنی ذات کے حوالے سے ہی برتنے میں ماہر اور خواہش مند بھی۔ وہ کسی ناصح کسی شیخ کسی قاصد کسی پیامبر کی ضرورت محسوس نہیں کرتی۔ ان کا یہ انداز بھی ان کے عشق میں ایک خود مختاری و خود اختیاری کی کیفیت کو پیدا کرتا ہے۔ ان کے یہاں کسی خیال کی معنی آفرینی یا خیال بندی کی صفات کو واضح کرنے والی پرواز تخیل نظر نہیں آتی بلکہ ان کا تخیل ان کی اپنی ذات یا کیفیت سے قوت کو حاصل کرتا ہے ان شاعرات کی کائنات غزل پر غیر حقیقی ہونے کا گماں نہیں ہوتا بلکہ ان کی غزلوں میں پیدا شدہ اپنے حالات اتنے ذاتی و مخلص معلوم ہوتے ہیں کہ ہم اسے اعترافی شاعری کا نام دیں تو غلط نہ ہوگا۔ انھوں نے اردو غزل میں کئی امتیازات پیدا کیے جس میں پہلی صفت خود ان خواتین کا تصور عشق ہے۔ ان شاعرات نے 'عشق' کی جگہ لفظ 'محبت' کا استعمال بہت جگہ کیا ہے۔ اردو شاعری کے مرکزی لفظ کی اس تبدیلی نے شاعرات کے کلام میں دو افراد کے درمیان والی محبت اور اس سے متعلق نشیب و فراز کو بھی بخوبی دکھایا گیا ہے جس میں عورت گھر کی چہار دیواری سے نکل کر کسی ویرانے یا صحراؤں میں بھٹکتی ہوئی نہیں پائی جاتی، نہ ہی محبوب کا غم بھلانے کی خاطر مئے نوشی کا سہارا لیتی ہے بلکہ ان کے یہاں محبت میں صبر و شکر کا معاملہ نظر آتا ہے خواہ وہ کتنی ہی تکلیف میں ہوں۔ ان کے یہاں نہ تو کبھی چاک گریباں کا مضمون ملتا ہے نہ دشت و دریا صحرا و ویرانہ نظر آتے ہیں۔ ان خواتین کی غزلوں کے کردار مخلصانہ محبت کرنے اور محبت میں جینے مرنے والے کردار

ہیں۔ اسی ضبط واحتیاط کی فضا نے خواتین شعرا کی غزلوں کو اپنے معاصر شعرا سے مختلف رکھا ہے اور ان کے یہاں اظہار کی جو بھی کیفیات و تجربات ہیں ان میں ضبط، تحمل، صبر اور ناز ہے۔

شاعرات کے یہاں مختلف اوقات ورجحانات کے ساتھ ساتھ اظہار کے جو بھی پہلو سامنے آئے ہیں ان میں ایک اہم کردار ان کی لفظیات کا ہے انھوں نے اپنی روزمرہ کی زندگی سے قریب تر زبان کا دامن تھام کر رکھا ہے۔ ان کی زبان عام طور سے صاف اور گفتگو والے لہجے سے بے حد قریب نظر آتی ہے۔ ان کے یہاں کسی قسم کی کوئی اضافیات نہیں ملتی جس کی ایک بڑی اور معقول وجہ یہ ہے کہ ان کا کلام زبانی اعتبار سے ''اعتراف'' سے بہت نزدیک ہے۔ ان کے یہاں زیورات اور سنگھار کی اہمیت آرائش وزیبائش سے آگے بڑھ کر اپنے معروضات کے ذریعہ کلام میں نسائیت کے فطری وصف کو نمایاں کرنے کی کامیاب کوشش ملتی ہے ان کے یہاں ان تمام اشیا کے حوالے سے روزمرہ کی زندگی کے معاملات اپنے نشیب وفراز کے ساتھ برتے گئے ہیں جن میں دوپٹے آنچل چنری ردا اوڑھنی شال جیسے الفاظ کا استعمال ان کے تخلیقی محرکات کے ساتھ ہوا ہے۔ چند مثالیں:

اس دن آنچل دھانی تھا
اب ریت کے تانے بانے سے
اک چادر بن کے اوڑھی ہے
وہ پہلا روپ کہانی تھا

(ادا جعفری: اک پل گزرا یا جگ بیتے)

یاس حسرت بھری بے اماں زندگی
آس کے ریشمی آنچلوں میں گئی

(کشور ناہید)

غور سے دیکھا جائے تو یہ اعتراف بہت اہم اور معنی خیز ہے جس میں انھوں نے مرد اور عورت کے تعلقات کو ایک نئے سرے سے زندگی کے تمام تر تجربات و مشاہدات کی روشنی میں دیکھنے اور پرکھنے کی بات کہی ہے۔ انھوں نے ایک نئی عورت کی باشعوری کی داستان کو اپنی شاعری میں برتنے کی بھی بھرپور کوشش کی۔ یہ دراصل ایک شروعات تھی مرد اور عورت کے رشتے کی نفسیات کو سمجھنے کی اس پر غور وفکر کرنے کی۔ معاشرہ میں جس طرح پدرانہ نظام کے تحت گذشتہ دور کی شاعری میں اظہار ہو رہا تھا اس بنے بنائے نظام سے عورت باہر نکلتی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔ جس نے اب تک گھریلو چہار دیواری کی دنیا اور اس میں شامل رشتوں سے ہی نبرد آزما ہونا سیکھا تھا اس کی کائنات ایک فرمانبردار بیٹی، بہن، اطاعت گزار بیوی اور شفیق ماں کے دائرے سے آگے نہ بڑھ سکی تھی لیکن ان سبھی دائروں کی دنیا سے باہر جھانکنے کی اور اس دنیا کا حصہ بننے کی بھرپور کوشش شروع کی جس میں موجودہ دور میں وہ کامیاب و کامران ٹھہرتی ہے۔ اور اب اس کی دنیا تبدیل ہو چکی ہے۔ خود اعتمادی وخود آگہی کا احساس اس کی شخصیت میں شامل ہو گیا ہے۔ آج وہ روایت شکنی کے در پر کھڑی ہے اور ہر طرح سے مرد سے مقابلے میں خود کو اپنی ذات کو فوقیت دینے لگی ہے۔

اردو شاعری میں مرد شاعر جس طرح محبت ہونے یا اس میں ناکامی پر اپنی دنیا اور اس سے جڑے متعلقات کے بکھرنے کا منظر نظم کرتے ہیں وہیں عورت اس کے برعکس عشق میں اپنے گھر سے لے کر اپنی ذات تک کو سجانے سنوارنے کا کام کرتی ہے۔ عشق کی کیفیت میں اسے گھر کی معمولی اشیاء بھی بہت خاص اور اہم لگتی ہے نسائی شاعری کے تناسب کے اعتبار سے دیکھا جائے تو خواتین شعرا کے شعری محرکات زیادہ تر فطرت سے اخذ کیے گئے ہیں یا پھر گھریلو اشیاء سے اس کی ایک بنیادی وجہ یہ بھی ہے کہ عورت کی دنیا ہی ہمیشہ اس کا گھر رہی اس نے گھر کی چہار دیواری کے اندر ہی سارے موسم دیکھے اور انھیں جیا جن سے متعلق محرکات میں وہ اپنے جذبات کا اظہار کرتی نظر آتی ہے۔

معاشرتی صورت حال میں واقع پذیر تبدیلیوں کو جو مرد باہر سے دیکھتے ہیں وہ ان کے تجربے و مشاہدے کا حصہ بنتے نظر آتے ہیں جو کبھی کبھی ان کے ذہنی انتشار کا سبب بھی بنتے ہیں لیکن عورت ان تبدیلیوں کو اپنے انداز سے دیکھتی ہے اور اس سے متعلق اپنے حسیاتی تجربات کو من وعن بیان کرنے کی قائل نظر آتی ہے اس کی عمدہ مثال ہمیں اردو نظم میں ملتی ہے۔ اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ تانیثیت کا جس قدر کھل کر اظہار اردو نظم میں ہوا ہے اتنا غزل میں نہیں ہو سکا تھا وجہ غزل کی نازک مزاجی رہی ہے جبکہ نظم اپنے موضوعاتی اظہار کی وجہ سے وسیع المعانی ہو جاتی ہے جہاں ہر طرح کے مضامین کو قلم بند کیا جا سکتا ہے یہاں اردو کی ان نظموں کی مثالیں پیش کی جاتی ہیں جو ماحول کی دہشت گردی کے سبب کسی عورت کے دل پر بیتنے والے درد اور ان سے وابستہ ان کے نکتہ نظر کو دکھاتے ہیں۔

شاعرات کے کلام میں نسائی زبان کے امتیازات نمایاں طور پر شامل رہے ہیں جس میں ان کا لہجہ طرز گفتگو زبان کی لطافت وحلاوت کے ساتھ ساتھ روزمرہ محاوروں کا استعمال ان کی خصوصیت کو ملحوظ رکھ کر پیش کیے گئے ہیں جس میں شاعرات کی کہیں کہیں شعوری اور کہیں لاشعوری ظاہر ہوتی ہے انھوں نے زبان کے معاملے میں حالی کے بیان ''محاورے زبان کے زیور کی حیثیت رکھتے ہیں اگرچہ ان کا بہترین استعمال کیا گیا ہو''

(مقدمہ شعر و شاعری: مولانا الطاف حسین حالی، ص 172، مرتب ڈاکٹر وحید قریشی) کو صادق کرتے ہوئے اپنے کلام میں برتا ہے۔

اس کے علاوہ شاعرات کے کلام کا امتیازی وصف زبان کے تخلیقی استعمال کو نسائی اعتبار سے فطری اوصاف کا پابند بنانے اور دوران گفتگو زبان کے ذریعہ نسائی حرکات وسکنات کو بھی نمایاں کرنے کا ہے جو کہ ان کا اختصاص ہے۔ چند مثالیں پیش نظر ہیں:

بیٹیوں نے مرے شہر میں
آنسوؤں سے دپٹے رنگے

(ادا)

دیکھ کر جس شخص کو ہنسنا بہت
سر کو اس کے سامنے ڈھنکنا بہت

(کشور ناہید)

بس یہ ہوا کہ اس نے تکلف سے بات کی
اور ہم نے روتے روتے دوپٹے بھگو لیے

(پروین شاکر)

اردو شاعری میں خصوصی طور پر شاعرات کے کلام میں 'آنگن' کا تذکرہ بہت موثر انداز میں پیش کیا گیا ہے حالانکہ یہ روایت بہت پرانی ہے لیکن شاعرات نے اس سے اپنے ذاتی تجربات ومشاہدات کو وابستہ کر کے اسے ایک نیا پن بخشا ہے۔ غور طلب رہے کہ جدید شاعری کے دور میں گھر اور آنگن کا استعارہ بڑی شدت سے استعمال ہوا لیکن شاعرات کے یہاں یہ لفظ محض فیشن پرستی کے سبب نہیں بلکہ فطری طور پر نظر آتا ہے دراصل عورت کا وجود ہی آنگن جیسا ہے جو سبھی کی بنیاد ہے۔

تاریخ اس بات کی گواہ رہی ہے کہ عورت نے روز ازل سے لے کر مرد کا ہر قدم پر ساتھ دیا ہے بروز ازل سے چلی آرہی مرد و عورت کی ملی جلی کائنات میں عورت کو بھلے دوئم درجہ ملا ہو لیکن اس نے فرائض ہمیشہ اولین سطح پر نبھائے ہیں اس کی مثال ہمیں احادیث سے لے کر قرآن کی تفسیر میں بھی ملتی ہیں جہاں اسلامی تاریخی عورتوں کا حوالہ دے کر شاعرات نے خصوصی طور پر ایک نئی طرز ایجاد کی جس کا انداز 'تلمیح' کے پیرائے میں تھا ان تلمیحات میں حضرت عیسی، حضرت موسی، ابراہیم، گوتم بدھ، دشینت، شیو جیسے وابستہ واقعات وتصورات کا اظہار نسائی حوالے سے کیا گیا، جس میں برسوں سے چلی آرہی عورت کی ناقدری پر سوال قائم کیے گئے جہاں عورت نے اپنے ناکردہ گناہ کی سزا کے لیے آواز بلند کی اور صدیوں سے چلی آرہی اپنی ذات کی تذلیل کے جواب میں اظہار خیال کیا اس سلسلے میں کئی شاعرات کے کلام منظر عام پر آئے جن میں ہم گنہ گار عورتیں: کشور ناہید، نک نیم، صرف ایک لڑکی: پروین شاکر، میں بچ گئی ماں: زہرا نگاہ، عورت اور نمک: سارا شگفتہ، چادر اور چہار دیواری: فہمیدہ ریاض، بنت حوا: ثروت سحر، آدھی گواہی: نسیم سید، میں اور ہی کوئی حادثہ ہوں: عذرا پروین، نئی عورت کا ترانہ: بلقیس ظفیر الحسن، عورت اور مرد، الحق: شہناز نبی قابل ذکر ہیں یہاں ہم چند مثالیں پیش کرتے ہیں جن میں تاریخ کے تناظر میں عورت کے ساتھ ہونے واکے سماجی استحصال کو موضوع بنایا گیا جس میں شخصی کرداروں مثلاً حضرت جویرہ، بلقیس، مریم، سیتا، درو پدی، شکنتلا، سے وابستہ واقعات وتصورات صدیوں پرانی عورت کی بے بضاعتی کی داستان بیان کرتے ہیں۔

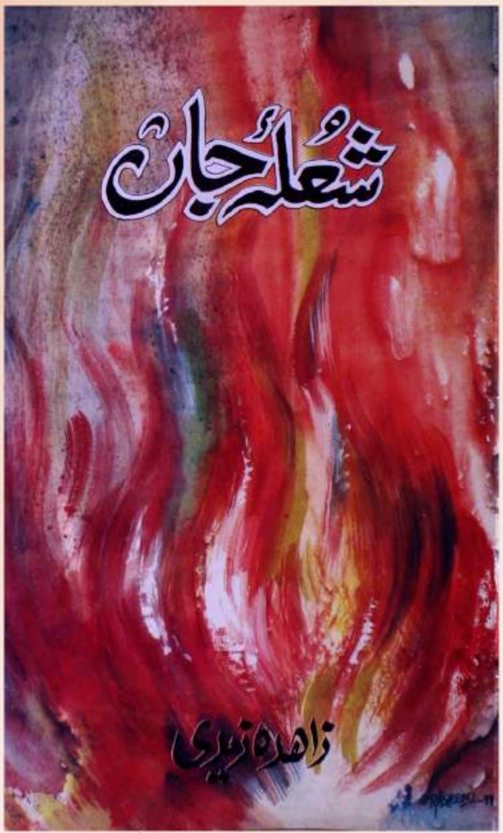

موجودہ دور میں مرد و زن کی زبان کے متعلق خیالات کے تناظر میں دیکھیں تو ہم پاتے ہیں کہ شاعرات کی تخلیقی زبان ہندی اور انگریزی کا اثر نظر آتا ہے ان کے یہاں مونث کا صیغہ فطری اور لاشعوری طور پر سامنے آیا ہے اس سلسلے میں یہ بات بھی غور طلب ہے کہ شاعرات کے یہاں ان کے اعمال و افعال جذبات و کیفیات کے اظہار کا وسیلہ نسائیت کے فطری امتیازات کو واضح کرتے ہیں۔ ان شعری امتیازات کے علاوہ شاعرات کے یہاں عاشق کے لیے استعارات وتشبیہات کا اہتمام نہیں ملتا بلکہ ان

کے یہاں 'اسمائے معرفہ' جس میں عاشق کو تم، وہ، اس، کہہ کر مخاطب کیا ہے ان اسماء کے ساتھ شاعرات نے جو صفتیں لگائی ہیں ان کے امتیازات سے مل کر اعمال کے بیان میں ایک نئی کاری گری پیدا کر دی ہے۔

اس کے بعد وقت کے ساتھ ساتھ ہی انھوں نے مرد عاشق کے لیے نئی نئی تشبیہات و استعارات جیسے چاند، پیڑ، سورج، امرت ساگر، بھی وضع کیے جیسے:

وہ چاند بن کے مرے ساتھ ساتھ چلتا رہا
میں اس کی ہجر کی راتوں میں کب اکیلی تھی

(پروین)

شاعرات کے یہاں تخلیقی اظہار کے لیے 'کنائے' کا استعمال بھی خوب ہنر مندی سے شعر کے اسلوب کو رمز و ایما اشارے کنائے کے اوصاف کے ساتھ برت کر کیا گیا ہے جس نے ان کے کلام کے فنی حسن کی معنویت میں اضافہ کیا ہے۔ اس کے علاوہ مجاز مرسل کے جن اوصاف کا استعمال شاعرات نے اپنے کلام میں کیا ہے اس سے ان کے یہاں تہہ داری بھی پیدا ہو گئی ہے جس میں ان کی عصری زندگی کی سفاکیوں اور تلخیوں سے لے کر ذاتی زندگی کے مشاہدات کا تخلیقی اظہار شامل ہے۔

شاعرات کے کلام میں پیکر تراشی ایک نمایاں وصف ہے جنھیں انھوں نے اپنے تجربات کی آنچ میں پکایا ہے اور پیش کیا ہے ان کے یہاں درد کے بادل، غم کی کھڑکی، غم کے آنگن، پھولوں کے آنچل، ہوا کا دھانی آنچل، سوچ کے پندے، ذہن کے شجر، دھوپ کی حکومت چاہتوں کی سرزمین، اسم جاں، جیسے تمام تشبیہی و استعاراتی پیکروں سے ان کا کلام بھرا ہوا ہے اس کے ساتھ ہی ان کے یہاں بصری، سمعی، شامی، ذوقی، اور احساساتی پیکر کے عمدہ نمونے ملتے ہیں چند مثالیں:

پھولوں کے آنچلوں میں تو تتلی کے رنگ ہیں
بانہوں کی کیاریوں میں سجے زندگی کی شام

(کشور)

ذہن کی دھوپ تو ہے درد کے بادل بھی سہی
بارش غم سے تو یہ اور نکھر جائے گی

(زاہدہ زیدی)

ان فنی خصوصیات کے ساتھ ہی شاعرات کے یہاں کچھ محرکات ایسے بھی ہیں جو مرد حضرات کے یہاں کثرت سے استعمال ہوئی تھیں جس کی سب سے بڑی مثال واقعہ کربلا کا شعری اظہار ہے۔ ان شاعرات کے یہاں یہ محرکات ردا آنچل اوڑھنی، مشکیزہ، پیاس پانی، فرات، دریا ساحل، خنجر، وغیرہ کا استعمال تخلیقی اظہار کے ساتھ کیا ہے۔

المختصر ہم یہ پاتے ہیں کہ شاعرات نے اس طویل سفر کی مسافت بڑے ہی صبر و تحمل سے طے کی ہے اور مردوں کے بنائے ہوئے ادبی اقدار کو سر کرنے میں بڑی حد تک کامیاب ہوئی ہیں۔ اگر ہم غور کریں تو پاتے ہیں مردوں کے مقابلے میں انھوں نے اپنی انفرادی حیثیت کا تعین کرنے والی شعریات بھی مرتب کر لی ہے۔ ان کے شعری موضوعات روایتی نہ ہو کر تجربات و مشاہدات کا حصہ رہے ہیں جس کے لیے انھوں نے جو اپنی لسانیات مرتب کی ہے وہ بظاہر تو مردوں کی شعری روایت سے مستعار ہیں لیکن باطنی طور پر وہ ان کی اپنی تخلیقی ترجیحات کی عکاس ہیں۔ تانیثیت کے نرم پہلو کو شاعرات نے جس طرح غزلوں میں اس کی وضع کو ملحوظ رکھتے ہوئے کیا ہے اسی طرح اس کے کڑے رخ کا بھرپور اظہار اردو نظم میں ملتا ہے۔ شعری وسائل کا استعمال وہ اپنے انداز میں کرنے میں بڑی حد تک کامیاب نظر آتی ہیں جس میں علامتیں پیکر تراشی اور استعارات کا حسی اور لمسی اظہار ان کا اختصاص ان کے یہاں نسائی فطرت کا پتہ دیتے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی ان شاعرات کے تخلیقی اظہار کا سب سے خصوصی پہلو تلمیحات کے حوالے سے سے اپنی راہ نکالنے کا بھی ہے جس میں تاریخی اور اساطیری مضمون سے انھوں نے خواتین کے حوالے اٹھائے اور انھیں عصری مسائل کے تناظر میں پیش کیا۔ موجودہ دور میں ہندوستان اور پاکستان میں جن شاعرات نے اپنے منفرد لہجے و آہنگ سے ادب میں اپنی موجودگی درج کروائی ہے ان میں شاہدہ حسن، شبنم شکیل، ثمینہ راجہ، نسیم سید، نوشی گیلانی، حمیرا رحمان، نصرت مہدی، فوزیہ رباب، شبنم عشائی، سدرہ سحر عمران، شکیلہ رفیق، حنا رضوی حیدر، عبیرہ احمد، عذرا پروین وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں۔ جنھوں نے تانیثیت کے حوالے سے اردو شاعری میں اظہار کے نئے امتیازات کے دریچوں کو کھولنے کا کام انجام دیا اور ایک طویل مسافت کی پرخار راہوں سے گزرتے ہوئے اپنے وجود کی زمین سے آسمان کی بلند وسعتوں تک پہنچنے کے مرحلے میں ہے۔

* * *

Fahmina Ali
Research Scholar
Begum Aziz un NisaHall,
Block 1, Medical colony
AMU Campus
Aligarh-202002 (U.P)

صوفی سمائرا

نئی تعلیمی پالیسی اور مادری زبان میں تعلیم کی اہمیت

تلخیص: 29 جولائی 2020 کو نئی تعلیمی پالیسی کو منظوری ملی۔ نئی تعلیمی پالیسی ماقبل اسکول کی سطح سے ہی ملک کے تعلیمی نظام کو مستحکم بنانے کی خواہش مند ہے۔ اسی لیے اس پالیسی کے تحت 4+3+3+5، چار مراحل پر مشتمل اسکولی تعلیم کا خاکہ پیش کیا گیا ہے۔ یعنی اب پری اسکول سے ہی بچے کی ذہنی نشونما کے ساتھ بنیادی خواندگی اور عدد شماری کو بہتر بنانے کی کوشش کی جائے گی۔ اسکولی تعلیم کا پہلا مرحلہ 5 سال پر مبنی ہوگا یہ مرحلہ 3 سے 8 سال کے بچوں کے لیے ہوگا۔ اس مرحلے میں بچہ تین سال آنگن واڈی یا پری اسکول میں تعلیم حاصل کرے گا اور باقی دو سال میں جماعت اول اور دوم کی تعلیم حاصل کرے گا۔ اسکولی تعلیم کا دوسرا مرحلہ تیسری جماعت سے پانچویں جماعت پر مبنی 8 سے 11 سال کے بچوں کے لیے ہوگا۔ تیسرا مرحلہ چھٹی، ساتویں اور آٹھویں جماعت کے گیارہ سے چودہ سال کی عمر کے بچوں کے لیے ہوگا اور آخری مرحلہ دو زمروں، نویں اور دسویں، گیارہویں اور بارہویں کلاس پر مشتمل ہوگا۔ یہ مرحلہ 14 سے 18 سال کی عمر کے بچوں کے لیے مختص ہوگا۔ GER کو بڑھانے اور ترک تعلیم (Dropouts) کی شرح کم کرنے کے لیے ایسے تعلیمی نظام کی ضرورت تھی جہاں تعلیم کے ابتدائی مراحل سے ہی بچے کے لیے ایسا ماحول فراہم کیا جائے جو اس کے لیے مانوس ہو، تاکہ وہ کھل کر اظہارِ خیال کر سکے۔ تحقیق سے ثابت ہوا ہے کہ بچے کی تقریباً 85% دماغی نشونما 6 سال کی عمر سے قبل مکمل ہو جاتی ہے۔ نئی تعلیمی پالیسی ان ابتدائی سالوں میں ہی بچے کی تعلیمی بنیاد کو مضبوط بنانے کی خواہش مند ہے کیونکہ ہندوستان میں کیے گئے مختلف سروے سے یہ بات سامنے آئی ہے کہ یہاں 6 سال سے قبل کی عمر کے بچوں کی نشونما میں کمی رہنے کی وجہ سے وہ بنیادی خواندگی اور عدد شماری میں پیچھے رہ گئے ہیں جس کی وجہ سے نہ وہ کتاب سے متن کو پڑھ پائے اور نہ ریاضی کے بنیادی عمل کو حل کر پائے۔ اس کمزوری کو مدنظر رکھ کر نئی تعلیمی پالیسی میں پری اسکول کو شامل کیا گیا ہے تاکہ 6 سال کی عمر میں جب بچہ درجہ اول میں داخل ہو تو اس کو ان چیزوں پر مہارت حاصل ہو۔ اس لحاظ سے مادری زبان کی اہمیت کو فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ مادری زبان ایک بچے کے اظہار کا پہلا وسیلہ بنتی ہے۔ یہ زبان اسے سکھائی نہیں جاتی۔ یہ زبان اس کے ذہن و شعور کا حصہ ہوتی ہے۔ اس زبان کے ذریعہ سے وہ دوسری زبانوں کو سمجھتا اور سیکھتا ہے۔ لیکن اسکولوں میں ذریعۂ تعلیم مادری زبان نہ ہونے کی وجہ سے بچے درس و تدریس کے عمل میں مکمل طور پر شریک نہیں ہو پاتے۔ ان عوامل کو مدنظر رکھ کر نئی تعلیمی پالیسی کی تجویز یہ ہے کہ بچے کو بنیادی تصورات مادری زبان میں سکھائے جائیں جب بچہ اس زبان میں لکھنا اور پڑھنا مکمل طور پر سیکھ جائے تب جا کر دوسری زبانوں کا تعارف کرایا جائیں۔ مادری زبان اور اسکول کی زبان کے مابین خلا کی وجہ سے بچوں کی تعلیمی نشونما پر پڑنے والے اثرات کا جائزہ لینے کے لیے پوری دنیا میں تحقیقی کام انجام دئے گئے جن سے یہ ثابت ہوا کہ مادری زبان میں تعلیم حاصل کرنے والے بچوں

کے نتائج ان بچوں سے بہتر آئے جنھوں نے اسکول میں ذریعۂ تعلیم کے طور پر استعمال ہونے والی ایک غیر مانوس اور اجنبی زبان میں تعلیم حاصل کی تھی۔ اسی لیے نئ تعلیمی پالیسی نے درجہ پانچ تک اسکولوں میں مادری زبان کو ذریعہ تعلیم کے طور پر تسلیم کرنے کی تجویز پیش کی ہے۔ ہاں یہ ایک مشکل کام ہوگا کیونکہ ہمارا ملک کثیر اللسان ہے۔ نہ جانے کتنی مادری زبانیں ایسی ہیں جو گمشدگی کی حالت میں ہے۔ نہ جانے کتنی زبانیں دم توڑ چکی ہیں۔ صرف 36 زبانیں ایسی ہیں جو اسکولوں میں ذریعہ تعلیم کے طور پر استعمال ہورہی ہے۔ بچے کی زبان اور اسکول کی زبان کے مابین خلا تعلیمی نظام کی کمزوری کی ایک بہت بڑی وجہ ہے۔ نئ تعلیمی پالیسی میں مقامی زبان، مادری زبان، علاقائی زبان، گھریلوں زبان کو اپنانے پر کھلی چھوٹ ہے مقصد یہ ہے کہ جو زبان بچوں کے ذہن و شعور کا حصہ بن چکی ہو تعلیم اسی زبان میں فراہم کی جائے۔

نئ تعلیمی پالیسی اور مادری زبان میں تعلیم کی اہمیت

زبان وہ بنیاد ہے جس کی بنا پر ترسیل ممکن ہے اور زبان سے ہی ہماری پہچان قائم ہوتی ہے زبان کسی بھی ملک کی تہذیب و تمدن، معاشرت اور ترقی کی اساس ہوتی ہے۔ زبان رابطہ کا جز لاینفک ہے۔ اسکول میں زبان کی اہمیت سے انکار ممکن نہیں۔ کیونکہ زبان ہی وہ ذریعہ ہے جس کے تحت ایک بچہ کلاس روم میں سیکھنے کے عمل سے گزرتا ہے۔ زبان ہی وہ ذریعہ ہے جس کے تحت بچے سوچتے، سمجھتے اور اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہیں اس طرح زبان ایک بچے کی ابتدائی نشوونما میں مرکزی کردار ادا کرتی ہے۔ انسان کا وجود جس ماحول سے وابستہ ہوتا ہے اس ماحول کا اس کی شخصیت پر گہرا اثر ہوتا ہے۔ وہ وہی زبان بولتا ہے جو اس ماحول میں بولی جاتی ہے۔ اگر ہندوستان کے دیہاتوں میں دیکھا جائے تو وہاں مادری زبان بولنے کا زیادہ رواج ملتا ہے۔ اس کے برعکس شہروں میں تجدید کاری کے اس دور میں مادری زبان کے بجائے بچوں کو انگریزی سکھائی جاتی ہے۔

ہندوستان ایک کثیر اللسان ملک ہے۔ 1961 کے مردم شماری کے مطابق ہندوستان میں 1652 مادری زبانیں بولی جاتی تھیں جو 2011 کے مردم شماری کے مطابق کم ہو کر 1369 کی تعداد کو پہنچ گئی ہے۔ گنیش دیوی ملک کے ممتاز ماہر لسانیات ہیں۔ انھوں نے 2010 میں Peoples Linguistic Survey of India میں سات سواسی زبانوں کی فہرست بنائی ہے اور یہ انکشاف کیا کہ ملک کی تقریباً چھ سو زبانیں ختم ہونے کے قریب ہیں۔ گزشتہ سات سالوں میں دو سو پچاس زبانیں پوری طرح ختم ہو چکی ہیں۔ دستور اساسی کے باب XVII میں دفعہ 343 کے تحت ''ہندی'' ہندوستان کی سرکاری زبان ہے۔ 1963 میں official Language Act کے تحت ہندی اور انگریزی دونوں ہندوستان کی سرکاری زبانوں کے طور پر تسلیم کی گئی۔ دستور ہند کے آٹھویں شیڈول میں بائیس زبانیں شامل ہیں جو اس طرح ہے: ہندی، بنگالی، مراٹھی، تلگو، تامل، گجراتی، اردو، کنڑ، اڑیا، ملیالم، پنجابی، اسامی، میتھلی، سنتالی، کشمیری، نیپالی، سندھی، ڈوگری، کونکنی، منی پوری، بوڈو، سنسکرت۔ ان تمام زبانوں میں ۳۶ زبانیں ایسی ہے جو اسکولوں میں ذریعہ تعلیم کے طور پر استعمال ہورہی ہے۔

36 languages used in country as medium of Instruction .(UDISE 2019-2020)1

اگر غور کیا جائے تو بخوبی واضح ہو جاتا ہے کہ یہ ایک بہت بڑا خلا ہے۔ نہ جانے کتنے بچے ایسے ہیں جو مادری زبان اور اسکول کی زبان کے مابین خلا کی وجہ سے تعلیم حاصل کرنے سے قاصر رہ جاتے ہیں۔ یا تعلیم کو بیچ میں چھوڑ دیتے ہیں۔ مثال کے طور پر ہندوستان میں راجستھانی، چھتیس گڑھی، بھوج پوری، میگاہی، ہریانوی وغیرہ ایسی زبانیں ہیں جو کروڑوں لوگ تو بولتے ہیں لیکن یہ زبانیں اسکولوں میں ذریعہ تعلیم کے لیے استعمال نہیں ہوتی ہے۔ اس صورت حال کو مد نظر رکھ کر اسکولوں میں ترک تعلیم Drop out rate کو کم کرنے کے لیے اور جی۔ یی۔ آر (GER) کو بڑھانے کے لیے نئ تعلیمی پالیسی کے تحت حکومت نے ملک کے تعلیمی نظام کو مزید مستحکم بنانے کا منصوبہ تیار کیا ہے۔

نئ تعلیمی پالیسی 2020 کے کچھ اہداف قابل غور ہیں:

1۔ نئ تعلیمی پالیسی کے مطابق بچہ اپنی مادری زبان میں بہ نسبت دوسری زبانوں کے جلدی سیکھتا ہے۔ ہندوستان چونکہ ایک کثیر اللسان ملک ہے اسی لیے بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ کئی جگہوں پر مادری زبان کے بجائے مقامی زبان، گھریلوں یا علاقائی زبان کا چلن زیادہ ہوتا ہے۔ اسی لیے نئ تعلیمی پالیسی میں اس بات پر زور دیا گیا ہے کہ درجہ پانچ (جس کو درجہ آٹھ تک بھی بڑھایا جا سکتا ہے) تک اسکولوں میں ذریعہ تعلیم مادری زبان/مقامی زبان/ گھریلوں زبان/علاقائی زبان ہو۔ اس کے لیے بچوں کو مادری زبان میں کتابیں فراہم کرنے کی تجویز بھی پیش کی گئی ہے اور جن زبانوں میں کتابیں دستیاب نہیں ایسے اسکولوں میں استاد اور بچے کے درمیاں ذریعہ کلام مادری زبان ہوگی۔

2۔ نئ تعلیمی پالسی کے مطابق تحقیق سے یہ بات سامنے آئی ہے کی بچہ زبان سیکھنے کے عمل میں 8۔2 سال کی عمر میں بہت فعال اور تیز ہوتا

ہے۔ اسی لیے ابتدائی تعلیمی مراحل سے ہی کثیر لسانی رویہ اپنایا جائے گا۔ اس لحاظ سے ابتدا میں بچے کو مادری زبان میں پہلے پڑھنا اور پھر لکھنا سیکھایا جائے گا اور اس کے بعد درجہ سوم سے دوسری زبانوں کو متعارف کیا جائے گا۔

3۔ سہ لسانی فارمولہ کو جاری رکھتے ہوئے بچوں کو تین زبانوں میں تیار کیا جائے گا اور اس کا اختیار بھی بچے کو ہوگا کہ وہ کون سی تین زبانوں کو منتخب کرے گا۔ کسی پر کوئی زبان تھوپی نہیں جائے گی۔ تین زبانوں میں سے دو زبانیں ہندوستانی ہوگی۔

4۔ نئ تعلیمی پالیسی میں اس بات پر بھی زور دیا گیا ہے کہ سائنس اور ریاضی میں اعلی معیار کی درسی کتابیں مادری زبان میں تیار کرنے کی حتی المقدور کوشش کی جائے گی تاکہ بچے ان دونوں مضامین کو اپنی مادری زبان/مقامی زبان اور انگریزی میں سوچ اور سمجھ سکے۔

5۔ نئ تعلیمی پالیسی میں ہندوستان کے تمام طالب علموں کو ان کے ملک کی تمام زبانوں سے واقفیت کرانے پر زور دیا گیا ہے اور یہ قرارداد بھی پیش کی گئ ہے کی بچوں کو چھٹی سے آٹھویں جماعتوں کے دوران EK BHARAT SHERSTHA BHARAT INITATIVE کے تحت ہندوستان کی کلاسیکی اور دوسری علاقائی زبانوں کے بنیادی صوتی آہنگ، حروف تہجی، قواعد اور ان زبانوں کی تاریخ کے متعلق بھی معلومات دی جائے گی۔

6۔ ہندوستان کی کلاسیکی زبانوں اور ان کے ادب کو محفوظ کرنے کے لیے اور یہاں کے طالب علموں کو ان سے واقف کرانے کے لیے ہندوستان کی کلاسیکی زبانوں کو اسکول کے نصاب میں رکھا جائے گا اور بچے کو اختیار ہوگا کہ وہ ان زبانوں کو اپنے لیے منتخب کر سکتا ہے۔ سنسکرت، پالی، پراکرت، فارسی، تامل، تلگو، کنڈا، ملیالم، اڈیا جیسی زبانیں بھی اسکولوں کے نصاب میں شامل رہے گی۔

7۔ اس لحاظ سے نئ تعلیمی پالیسی میں بچوں کو درجہ ٦ سے ١٢ میں دو سال کے لیے کسی کلاسیکی زبان کو سیکھنے کا موقع فراہم کیا جائے گا جس کو وہ اپنے تعلیمی سفر میں آگے جاری بھی رکھ سکتے ہیں۔

8۔ نئ تعلیمی پالیسی میں ہندوستانی زبانوں کے علاوہ غیر ملکی زبانوں کو بھی شامل کیا گیا ہیں جن میں کوریائی، جاپانی، تھائی، فرانسیسی، جرمن، ہسپانوی، پرتگالی اور روسی زبانیں شامل ہیں۔

ان نکات پر غور کرنے سے بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے کہ نئ تعلیمی پالیسی ہندوستان کے تعلیمی نظام کو پرائمری سطح سے ہی مستحکم بنانے کی خواہش مند ہے اور یہ بات بھی بخوبی عیاں ہو جاتی ہے کہ حکومت ہند کس طرح یہاں کی مختلف زبانوں کے تحفظ کے لیے کمربستہ ہے۔ طالب علموں کو ان کے ملک کی تہذیب و ثقافت، مختلف زبانوں اور ان کے ادب سے واقف کرانے کے لیے یہ اقدامات بہت ہی امید افزا ہیں۔ پرائمری سطح پر ذریعہ تعلیم مادری زبان کو تسلیم کیا گیا ہے۔ سہ لسانی فارمولہ کے تحت بچے کو ابتدا میں مادری زبان سکھائی جائے گی اس کے بعد مادری زبان کی مدد سے دوسری زبانیں سکھائی جائیں گی کیونکہ ایک زبان دوسری زبان کو سمجھنے میں مدد کرتی ہے۔ لیکن یہ ایک مشکل اور محنت طلب کام ہوگا جس کے لیے حکومت کو کئی ٹھوس اقدام اٹھانے ہوں گے جن میں مادری زبان میں اساتذہ کی فراہمی، سبھی سبجکٹ کی کتابیں اس کی مادری زبان میں مہیا کرنا وغیرہ بنیادی ضرورتیں ہوں گی۔

مادری زبان انسانی جذبات کے اظہار کا موثر ذریعہ ہے۔ مادری زبان کا انسان کی شخصیت پر گہرا اثر ہوتا ہے۔ مادری زبان کا ہماری سوچ، ہمارے جذبات و احساسات سے گہرا تعلق ہوتا ہے کیونکہ ہمارے اظہار پہلا وسیلہ بنتی ہے۔ اسی لیے یہ ہمارے دل و دماغ کا ایک حصہ بن چکی ہوتی ہیں۔ ایک بچہ اپنے احساسات خوشی، غم، ڈر، درد کا پہلا اظہار مادری زبان میں ہی کرتا ہے۔ اسکول میں تعلیم فراہم کرنے کا بنیادی وسیلہ 'زبان' ہے۔ زبان ہی وہ بنیادی وسیلہ ہے جس کے تحت کلاس میں سیکھنے کا عمل ممکن ہے۔ زبان ہی کے توسط سے ایک بچہ منطقی طور پر چیزوں پر غور و فکر کرتا ہے لیکن یہ سب تب ہی ممکن ہے جب بچہ اس زبان سے مکمل طور پر واقف ہو تاکہ جو اسے اسکول میں پڑھایا جائے اسے وہ فوری طور پر سمجھ سکے اور اپنے ذہن کا حصہ بنا سکے۔ اب اگر یہی تعلیم ایسی زبان میں فراہم کی جائے جسے بچہ سمجھ نہ سکے تو کیا وہ ذہنی طور پر چیزوں پر غور و فکر کر سکے گا؟ جب بچے کی مانوس زبان میں تعلیم فراہم کی جائے گی تبھی وہ کلاس روم میں متحرک اور فعال برتاؤ کرے گا۔ بچے کی ابتدائی تعلیمی نشو و نما میں بنیادی رول زبان کا ہے اور بچہ تب تعلیم حاصل کر پائے گا جب اسے اس زبان میں تعلیم فراہم کی جائے گی جس پر اس کی مکمل گرفت ہو تب ہی وہ کسی سبق کو اپنے کانوں سے سن کر یا اپنی آنکھوں سے دیکھ کر، تخیل کی مدد سے اپنے ذہن کا حصہ بنا سکتا ہے اور مزید غور و فکر سے نتیجے بھی اخذ کر سکتا ہے۔ گویا اگر سبق ہی اجنبی زبان میں دیا جائے گا تو وہ سبق اس کے ذہن و شعور کا حصہ بننے سے قاصر رہے گا جس کی وجہ سے سیکھنے کے عمل میں پیچھے رہے گا اور مختلف چیزوں سے واقفیت حاصل نہیں کر پائے گا۔ جو آگے چل کر اعتماد کی کمی کی وجہ بن سکتا ہے۔ نئ تعلیمی پالیسی 2020 میں اس بات پر خاصہ

زور دیا گیا ہے کہ بچے کو مادری زبان میں تعلیم فراہم کرنا خواندگی کے بنیادی مقاصد کے حصول کے لیے بنیادی ضرورت ہے۔ نئی تعلیمی پالیسی کے تحت اس بات پر بنیادی توجہ دینے پر زور دیا گیا ہے کہ اسکول میں پرائمری سطح پر بچے کی مادری زبان اور اسکول کی زبان کے مابین خلا کو پُر کرنے کی کوشش کی جائے۔ اس لحاظ سے پرائمری سطح پر بچے کی مادری زبان میں ہی تعلیم فراہم کرنا نئی تعلیمی پالسی کی بنیادی تجویز ہے۔ اگر تعلیم کے ابتدائی مراحل میں بچے کو اس کی مادری زبان میں تعلیم فراہم کی جائے گی تبھی وہ فعال طور پر سیکھنے کے عمل میں متحرک رہے گا کیونکہ یہ زبان اس کے ذہن وشعور کا حصہ بن چکی ہوتی ہے۔

بچے 2 سے 3 سال کی عمر میں اپنے گھروں میں مادری زبان سیکھتے ہیں، جب اسکول میں داخلہ لیا جاتا ہے تو اسکول میں ایک اجنبی اور نامانوس زبان سے ان کا واسطہ پڑتا ہے۔ تحقیق کے مطابق ہندوستان میں 35 فی صد بچے ایسے ہیں جو پرائمری سطح کی تعلیم ایک ایسی زبان میں حاصل کرتے ہیں جو ان کے لیے اجنبی اور غیر مانوس ہوتی ہے۔ جب بچہ اسکول کی زبان بولنے اور سمجھنے سے قاصر ہوتا ہے تو درس وتدریس یک طرفہ عمل بن جاتا ہے جس میں استاد درس تو دیتا ہے مگر بچہ اس سے جڑ نہیں پاتا ہے۔ پرائمری سطح پر بجز اس کے کہ بچے سے جبراً اسکول کی زبان بلوائی جائے ان کو مادری زبان میں مکمل طور پر اپنے اپنے خیالات کے اظہار کرنے کا موقع دیا جاسکتا ہے تاکہ بہتر نتائج حاصل ہو سکے۔ اسی لیے تحقیق سے یہ ثابت ہوا ہے کہ جو بچے مادری زبان میں تعلیم حاصل کرتے ہیں ان کے نتائج اجنبی زبان میں پڑھنے والے بچوں سے بہتر ہو تے ہیں۔ مثال کے طور پر Annual ASER)Status of Educational Report 2019 کے مطابق ہندوستان کے دیہی علاقوں میں صرف 16.2 فی صد درجہ اول کے بچے ایسے پائے گئے جو درجہ اول کی کتاب کے متن کی قرأت کرنے میں کامیاب رہے اور صرف 39.5 فیصد بچے ایسے پائے گئے جو ایک عدد والے نمبر کا جمع زبانی کر پائے۔ کیونکہ دیہی علاقوں میں بچہ گھر میں مادری زبان بولتا اور سمجھتا ہے جبکہ اسکول کی زبان اس کی مادری زبان نہ ہونے کی وجہ سے وہ بنیادی خواندگی اور عددشماری میں پیچھے رہ جاتا ہے۔ اسی طرح ہندوستان کے آدی باسی علاقوں میں ایک تحقیق (Saikia and Mohanty 2004) کے مطابق وہاں ان بچوں کے نتائج بہتر آئے جن کو مادری زبان میں تعلیم فراہم کی گئی ان بچوں کے مقابلے میں جن کو اسکول کی زبان میں تعلیم فراہم کی گئی تھی۔

ہندوستان کے تعلیمی نظام میں ہمیشہ سے ہی مادری زبان کی اہمیت کو ابھارا ہے۔ دستور اساس میں دفعہ A 350 میں مادری زبان پر زور دیا گیا ہے۔

"adequate facilities for instruction in the mother-tongue at primary stage of education to children belonging to linguistic minority groups "2

اسی طرح کوٹھاری کمیشن (66-1964) میں یہ تجویز پیش کی گئی تھی کہ ہندوستان کے آدی واسی علاقوں میں بچوں کو تعلیم کے ابتدائی دو سالوں میں مادری زبان میں تعلیم فراہم کی جائے۔ Right to Education Act، 2009 میں بھی اسکولوں میں ذریعہ تعلیم کو بچو کی مادری زبان کو تسلیم کرنے پر زور دیا گیا۔ مادری زبان کو اسکول میں ذریعۂ تعلیم کے طور پر اپنانے سے کلاس روم کا ماحول زیادہ متحرک اور فعال دیکھنے کو ملتا ہے۔ جہاں بچہ بنا کسی خوف وحراس کے اپنے خیالات کا اظہار کرتا ہے ۔ اس طرح اس میں اعتماد بڑھتا ہے۔ اس کے برعکس اسکول کی زبان میں تعلیم حاصل کرنے والے بچے کلاس میں غیر متحرک رہتے ہیں۔ استاد سے دیے گئے سبق کو صحیح طور پر نہ سمجھنے کی وجہ سے ان میں اعتماد کی کمی ہو جاتی ہے اور کلاس میں خوف اور ڈر کا ماحول بن جاتا ہے جس کا سیدھا اثر ان کی تعلیم پر پڑتا ہے۔ مادری زبان میں تعلیم فراہم کرنے سے بچے کی تعلیم میں بہتری آئے گی نہ کہ وہ ایک نئی زبان کو سمجھنے میں بنیادی تصورات کو ہی فراموش کر دے گا۔ مادری زبان میں ایک بچہ بے جھجک اپنی بات بول دیتا ہے اور اس طرح اس میں خود اعتمادی کا جذبہ ابھرتا ہے اور وہ مثبت ردعمل دکھاتا ہے۔

نئی تعلیمی پالیسی کا ہدف یہ ہے کہ ملک کا GER 2030 تک 50 فیصد تک بڑھایا جائے گا اور اس کو بڑھانے میں مادری زبان کا ایک اہم رول ہوگا۔ امید ہے کہ اس تعلیمی پالیسی سے ملک میں ایک بہتر اور مضبوط تعلیمی نظام کا نفاذ عمل میں لایا جائے گا۔

حوالہ جات

1.https;//dashboard.udiseplgev.in/assets/images/pdf/UDISE 2019-20-booklet.pdf

2. https:/legislative.gov.in/sites/default/files/COI.pdf

□□□

Soofi Sumaira
Research Scholar
Kashmir University, Hazratbal
Srinagar-190006 (Jammu & Kashmir)

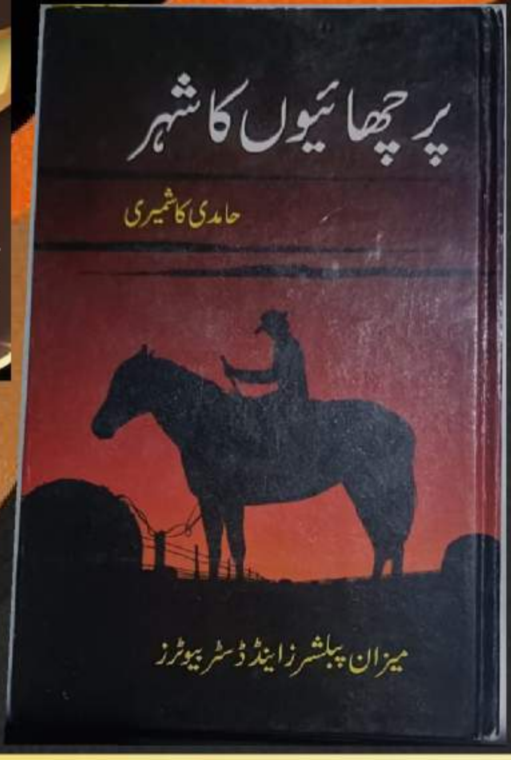

صائمہ جان

ناولٹ

'پرچھائیوں کا شہر'

ایک نفسیاتی مطالعہ

انسان قدرت کا پیدا کردہ ایک بہترین نمونہ مانا جاتا ہے جس کو خالق کائنات نے احساسات، جذبات اور شعور سے سرشار کر کے اشرف المخلوقات کے درجے سے نوازا ہے۔ چونکہ انسان ازل سے ہی اپنے فطری جذبۂ تلاش سے مجبور ہوکر اپنی ذات کی تلاش کے لیے فکرمند رہا ہے نیز کائنات کے اسرار ورموز کو سمجھنے میں غوطہ زن بھی ہوا۔ یہی جذبہ تلاش اس کو علم نفسیات تک لے آیا جس کی وساطت سے وہ ان گھتیوں کو سلجھانے میں بہت حد تک کامیاب بھی رہا۔ اس تناظر میں کہا جاسکتا ہے کہ نفسیات کا انسانی زندگی کے ساتھ گہرا اور براہ راست تعلق ہے جو زندگی کے ہر ایک پہلو، خارجی ہو یا داخلی، شعوری ہو یا لاشعوری کا احاطہ کرتا ہے۔ انسان چونکہ اپنے تمام تر احساسات، تجربات، جذبات اور خیالات سمیت ادب کا موضوع خاص رہا ہے۔ بنابریں ادب اور نفسیات ایک دوسرے کے لیے لازم وملزوم قرار پائے۔ دونوں کا سروکار انسانی زندگی سے ہے اور دونوں اسی سے اپنا مواد اخذ بھی کرتے ہیں۔ گویا یہ کہنا بجا ہوگا کہ ہر ادبی فن پارہ چاہے نثری صورت میں ہو یا شعری پیکر میں، کسی نہ کس نفسیاتی عمل کا زائیدہ ہوتا ہے۔

اردو فکشن کی ایک اہم صنف ناول اپنے وسیع کینوس کے تحت حقیقی زندگی کو کرداروں کے توسط سے تمام تر تبدیلیوں، رویوں اور رجحانات کے ساتھ اپنے دامن میں سمیٹا ہوا ہے۔ بنیادی طور پر ہر انسان اپنے مزاج کے طور پر دوسرے انسان سے منفرد ہوتا ہے جس کی وجہ سے اس کی نفسیات میں بھی تضاد پایا جاتا ہے۔ اسی تضاد اور افتراق کو ناول نگار کرداروں کی پیشکش کے ذریعے بڑے ہی فنکارانہ انداز میں پیش کرتا ہے۔ کسی بھی ادبی تخلیق میں ادیب کی اپنی نفسیات بڑی اہمیت کی حامل ہوتی ہے۔ اس لیے ناول کا ہر تحریر کردہ جملہ ناول نگار کی نفسیات اور اس کے ماحول اور حالات کا عکاس ہوتا ہے۔ اردو ادب میں نفسیات کے حوالے سے آج تک کئی کامیاب فن پارے ہمارے سامنے آئے ہیں۔ ان ہی میں حامدی کاشمیری کا ناولٹ ''پرچھائیوں کا شہر'' بھی ایک اہم اور قابل قدر فن پارہ ہے۔

حامدی کاشمیری سرزمین کشمیر سے تعلق رکھنے والے ایک جلیل القدر شاعر، محقق، نقاد اور فکشن نگار کی حیثیت سے نہ صرف جموں وکشمیر کے اردو ادب میں بلکہ ملکی اور غیر ملکی سطح پر بھی ایک دبستان کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اپنی علمی اور تخلیقی صلاحیت کی بناء پر انھوں نے جن اصناف پر طبع آزمائی کی ہے ان میں قابل قدر کارنامے انجام دیئے ہیں۔ حامدی کاشمیری نے دیگر اصناف کی طرح ناول نگاری میں بھی اپنے جواہر دکھا کر ایک نمایاں مقام حاصل کیا ہے۔ ان کے چار ناول ''بہاروں میں شعلے''، ''پگھلتے خواب''، ''اجنبی راستے''، ''بلندیوں کے خواب'' اور ایک ناولٹ ''پرچھائیوں کا شہر'' منظر عام پر آچکے ہیں۔ ان کے ناولوں میں جہاں کشمیر کے خوبصورت اور دلکش مناظر کی عکاسی دیکھنے کو ملتی ہے وہیں ان میں یہاں کے لوگوں کی

سیاسی، سماجی، معاشی اور تہذیبی زندگی کے نشیب و فراز کو بھی دیکھا جا سکتا ہے۔ حامدی کاشمیری کو چونکہ انسان کے باطن میں چھپے کرب کی شدت کو سامنے لانے کے لیے اپنی تخلیقی توانائی کا اظہار پھیلاؤ میں نہیں بلکہ گہرائی میں کرنا مقصود تھا اس لیے انھوں نے ناولٹ کے فن کا انتخاب کر کے انسانی ذہن میں گونجتا ہوا شور، دبی ہوئی خواہشات، جذبات و احساسات، ذہنی و نفسیاتی الجھنوں کی گرہ کشائی کی ہے جو "پرچھائیوں کا شہر" کی صورت میں سامنے آیا۔ اس حوالے سے منصور احمد منصور یوں رقمطراز ہیں:

> "پرچھائیوں کا شہر" ان کا اہم ناولٹ ہے۔ یہ ان کے فکر و فن کا ایک نیا موڑ بھی ہے۔ یہاں وہ داخلیت کے محشرستان میں دکھتے نظر آتے ہیں۔ وہ انسان کے اندرون کے پیچیدہ مسائل کو اپنی رسا کا ہدف بناتے ہیں۔"

(منصور احمد منصور، موج قلم، سرینگر: میزان پبلشرز 2011، ص 175)

"پرچھائیوں کا شہر" ماہنامہ "شاعر" کے خصوصی شمارہ ناولٹ نمبر 1971 میں پہلی بار شائع ہوا تھا۔ یہ ناولٹ جہاں مرکزی نسوانی کردار کی نفسیاتی الجھنوں کی پردہ کشائی کرتا ہے وہیں دو اور متحرک کرداروں کی نفسیاتی کیفیتوں کو مختلف صورتوں میں پیش کرتا ہے۔ ان کرداروں کے درمیان تضاد اور افتراق چاہے محبت کا ہو یا نفرت کا، ان کے ذہنی پرتوں کو کھولتا ہے۔ ناولٹ میں حامدی کاشمیری جگہ جگہ کرداروں کے نفسیاتی الجھاو ٔکے تحت ان کے عمل اور ردعمل کی طرف ہماری توجہ مبذول کراتے ہیں۔ ناولٹ میں جہاں EriksonErik کی Identity Crises Theory یعنی شناخت کے بحران کے نظریے کا اثر دکھائی دیتا ہے وہیں فرائڈ کے نظریات کی بھی توثیق ملتی ہے۔ جہاں تک ناولٹ کے مرکزی کردار صفیہ کا تعلق ہے تو وہ ایک بااعتماد، خود دار، تعلیم یافتہ، روشن خیال، صنفی مساوات کی حامی ہونے کے باوجود مرد اساس معاشرے میں اپنے تشخص ذات کے بحران کا شکار ہو جاتی ہے۔ عورت ازل سے ہی تشخص ذات کے کرب سے گزرتی آئی ہے۔ Erik Erikson کے نظریے کے مطابق تشخص کا بحران دراصل انسان کی زندگی میں تب لاحق ہوتا ہے جب اس کی زندگی میں بے یقینی اور تحفظ ذات کی جبلتیں برسرکار ہوتی ہیں۔ یہ احساس اکثر اس وقت نمو پذیر ہوتا ہے جب کوئی غیر متوقع سانحہ پیش آئے۔ صفیہ چونکہ افضل کے جنسی استحصال کا شکار ہو کر اسی بحران میں مبتلا ہو جاتی ہے، جس کی وجہ سے اس کی شخصیت میں بہت سی نفسیاتی الجھنیں وقوع پذیر ہوتی ہے۔ شناخت کے بحران کے تحت اس کی نفسی و ذہنی افتاد سے بھرپور یہ اقتباس ملاحظہ ہو:

> "دوسرے لمحے وہ جب چکراتی ہوئی اٹھی تو اسے محسوس ہوا کہ وہ قبرستان سے آئی ہوئی کوئی مسخ شدہ لاش ہے جس کے سارے رشتے شکست ہو چکے ہیں جسے معلوم نہیں کہ وہ کہاں جا رہی ہے۔"

(حامدی کاشمیری، پرچھائیوں کا شہر، سرینگر: میزان پبلشرز، 2017، ص 30)

مندرجہ بالا اقتباس سے بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ افضل کی سفاکانہ حرکت نے صفیہ کی شناخت کو تہس نہس کر کے رکھ دیا ہے۔ صفیہ کی نفسیات کے جو دوسرے محرکات نظر آتے ہیں وہ اسی بحران کے پیدا کردہ ہیں۔ گو کہ وہ ایک مثبت رویہ رکھنے والی لڑکی تھی لیکن اس سانحہ نے اس کے اندر منفی جذبات جیسے نفرت، خوف، تنہائی اور غصہ جیسے جذبات کو جنم دیا۔ وہ افضل سے نفرت میں اس حد تک گرفتار ہو گئی کہ اس کا ذکر بھی اس کے رگ رگ میں زہر گھولتا ہے اور خواب آور دوائیوں کے باوجود وہ اس ذہنی کوفت سے خود کو آزاد نہیں کر پاتی۔ ملاحظہ ہو یہ اقتباس جو صفیہ کے خوف اور احساس نفرت کی غمازی کرتا ہے:

> "اس کے جی میں آیا کہ وہ ان کے چہرے پر تھوک دے اور کھٹاک کر دروازہ بند کرے لیکن اس کے بازو جم گئے تھے اور جب اس کی بینائی اسے واپس ملی تو اس نے دیکھا کہ وہ کمرے میں بند دروازے کے ساتھ چمٹی ہوئی بری طرح ہانپ رہی ہے شاید اس نے اس گرجتی رات میں کسی بھوت کو دیکھ لیا ہو۔۔۔ وہ پسینے میں شرابور ہو چکی تھی اور اسے خیال ہی نہ رہا کہ وہ کب تک اسی طرح کھڑی تھرتھراتی رہی۔۔۔"

(ایضاً، ص 38-39)

صفیہ جبلتِ نفرت اور خوف کے علاوہ مختلف وہموں (Hallucination) کا بھی شکار ہو جاتی ہے جو اکثر کسی غیر متوقع حادثے یا شدت احساسات و جذبات کے طور پر نظر آتے ہیں۔ صفیہ کو اسی نفسی ہیجان کے تحت کبھی حقیقت خواب محسوس ہوتی ہے تو کبھی خواب حقیقت معلوم ہوتا ہے اور وہ لاشعوری طور پر خوف و خیال کے زیر اثر آ جاتی ہے۔ علاوہ ازیں صفیہ اپنی عملی زندگی میں متضاد رویے اور جذبات (Ambivalence) کی شکار نظر آتی ہے۔ رویے کا یہ تضاد شادی کے بعد اس کی زندگی میں یوں نظر آتا ہے کہ وہ خارجی طور پر افضل سے نفرت تو کرتی ہے لیکن عملی طور پر ایک پرستار اور اطاعت گزار بیوی بن کر افضل کا خیال رکھتی ہے۔ یہ رویہ یہاں پر ایک سوالیہ نشان کھڑا کرتا ہے جس سے قاری تذبذب کا شکار ہوتا ہے کیا صفیہ واقعی افضل سے نفرت کرتی ہے؟۔ اس رویے کا غماز یہ اقتباس دیکھیے:

> ''وہ اسی دن سے بستر پر دراز تھے اور وہ سب کچھ بھول کر ان کی تیمارداری میں منہمک رہی۔ بخار اترنے کا نام نہیں لے رہا تھا اور اس کی بے چینی بڑھ رہی تھی۔ وہ اپنا سارا سکون کھو بیٹھی تھی۔ وہ جلد سے جلد انہیں صحت منداور مضبوط دیکھنا چاہتی تھی۔ ان کے مضبوط بازوؤں میں وہ دنیا کی ہر آفت اور گزند سے محفوظ تھی۔ کیا اسے سچ مچ ان سے نفرت تھی؟''

(ایضاً،ص 50-49)

صفیہ کی زندگی میں اصل طوفان تب آتا ہے جب اس پر افضل کے ناجائز بچے کا حمل ٹھہرنے کی خبر کالے حروف بن کر گرتی ہے۔ اس کی زندگی میں امید کی شعاعیں اور خوشی کی کرنیں ہمیشہ کے لیے بجھ گئیں اور تنہائی کا کرب اس کا مقدر بن گیا۔ ذیل کے اقتباس میں یہی ذہنی اور نفسیاتی کیفیت جو الم انگیزی اور دل شکستگی سے لبریز ہے صفیہ کی خود کلامی سے مترشح ہوتی ہے:

> ''سنو ماں، میں زخموں سے چور ہوں۔ لو میں زخموں سے پردہ اٹھاتی ہوں۔۔۔ یہ دیکھو، یہ سب تمھارے چہیتے بھتیجے کی مہربانی ہے اور اب انھوں نے مجھے ہمیشہ کے لیے تباہ کیا ہے۔۔۔ میں ان کے گناہ کو کیوں کر چھپاؤں۔۔۔؟ ۔۔۔ میں کہاں جاوں ماں؟ وہ چیخ مار کر بیہوش ہوگئی۔''

(ایضاً،ص46)

صفیہ اپنی صنفی کمزوری کے علاوہ سماجی رویوں اور ردعمل سے مجبور اور فرائڈ کے نظریہ ماورائے خودی (Superego) کی بالادستی سے افضل سے شادی اور اسقاط کے لیے تیار ہو جاتی ہے۔ گو کہ ایک عورت کے لیے ماں بننا ایک دلکش اور خوبصورت عمل ہوتا ہے اگر اس میں اس کی مرضی اور شوق شامل ہو۔ لیکن یہاں پہ یہ عمل جنسی زیادتی کا نتیجہ ہے اور دوسری طرف افضل سے شادی صفیہ کی محبت کے بجائے معاشرتی ضرورت کا ردعمل تھا اسی لیے یہ دونوں صورتیں اس کے لیے کرب ناک ثابت ہوئیں۔

افضل ایک منفی اور ایذا رساں ذہنیت کا مرد ہوتا ہے۔ اس کی نفسیاتی اور جنسی الجھنوں کا جائزہ لیتے ہوئے اندازہ ہوتا ہے کہ اس کے سارے رویوں کی بنیاد اور سرچشمہ احساس کمتری کی الجھن ہے۔ اسی الجھن کی نذر افضل کی پہلی بیوی حسینہ اور بعد میں صفیہ ہوگئی۔ افضل صفیہ کو اپنی ملکیت سمجھ کر اس کے ساتھ زنا بالجبر کر کے اسے اپنے لیے عمل امتیاز اور مردانگی سمجھتا ہے جو روز ازل سے ہی مرد کی نفسیات میں پیوست ہے۔ گویا یہ جنسی زبردستی ایک طرح کے اختیار اور طاقت کا طریقہ اظہار ہے۔ اس حوالے سے کشور ناہید یوں رقمطراز ہیں:

> ''زنا کرنے والے گھر میں جنسی آسودگی سے محروم، بیوی کی درشتی سے تنگ، اور اپنی ذات اور جنس کے بارے میں اس قدر احساس کمتری میں مبتلا ہوتے ہیں کہ ان کا تحت الشعور اسی احساس کمتری کے خلاف بغاوت کرتا ہے۔''

(کشور ناہید، عورت خواب اور خاک کے درمیان، لاہور، سنگِ میل پبلی کیشنز، 1995، ص 57-56)

کشور ناہید کے مطابق انسانی تاریخ اس بات کی گواہ ہے کہ عورت کے ساتھ جنسی زبردستی کے دوران اس کا چیخنا چلانا، منتیں کرنا، اس کا خوف زدہ ہونا مرد کی اصل مردانگی تصور کی جاتی ہے۔ افضل چونکہ بچپن سے ہی کند ذہن، شرارتی، غیر ذمہ دار اور تخریبی رویے میں مبتلا تھا جس کی وجہ سے اس کے والدین بھی اس سے ناخوش تھے۔ وہ شراب کے نشے میں دھت ہو کر کئی کئی دن گھر سے باہر رہتا تھا۔ ان ہی وجوہات کی بناء پر وہ صفیہ کی با اعتمادی، روشن خیالی اور خودداری سے نفرت اور عداوت رکھنے لگا جس کے نتیجے میں وہ احساس کمتری کا شکار ہو جاتا ہے۔ اس تناظر میں ڈاکٹر سلیم اختر لکھتے ہیں:

> ''کند ذہن، نکمے، پھوہڑ، بدتمیز اور جسمانی عوارض میں مبتلا بچے اس احساس کے بار تلے دبے ہوتے ہیں اور ان سب میں کوئی نہ کوئی عضوی خامی ضرور موجود ہوتی ہے۔ اس احساس کمتری کی وجہ سے بچہ کئی قسم کے ردعمل سے دوچار ہوتا ہے۔ بعض بچوں میں خوف، شرمیلا پن، ضرورت سے زیادہ تابعداری اور دوسروں پر ضرورت سے زیادہ انحصار رکھنا۔۔۔ بعض اوقات حسد، نفرت، عداوت اور غصہ وغیرہ بھی اس کی بنا پر فطرت ثانیہ بن کر رہ جاتے ہیں۔''

(ڈاکٹر سلیم اختر، تین بڑے نفسیات دان، لاہور، سنگِ میل پبلی کیشنز، 2020، ص196)

افضل کے اسی الجھاؤ کا نشانہ صفیہ بن جاتی ہے۔ وہ پہلے سے ہی اپنی برتری ثابت کرنے کے لیے صفیہ کو روندتا چلا جا رہا تھا اور اس کی تکلیف میں اپنی لذت کشید کرتا ہے۔ افضل کے اس نفسیاتی ہیجان کا حامل یہ اقتباس ملاحظہ ہو:

> ''لمحہ بھر میں ان کی شراب آلود سانسیں اس کی آنکھوں، رخساروں اور نتھنوں پر ہتھوڑے برسا رہی تھیں اور ان کے لمبے سیاہ ہاتھ پھیل کر اس کی گردن میں پیوست ہو رہے تھے ان کی دو دہکتی آنکھیں۔۔ دہکتے سلاخ، وہ چیختی، چلاتی ہانپتی رہی۔۔ اس نے اپنے سارے دانت ان کے

> بازوں میں گڑھ دیئے۔ منہ خون سے بھر دیا۔۔۔ وہ گڑگڑاتی رہی۔ روتی رہی اور رسول کا واسطہ دیتی رہی، تلملاتی رہی، یہاں تک کہ اس کے بازو نڈھال ہو کے فرش پر گر پڑے۔"

(حامدی کاشمیری، پرچھائیوں کا شہر، سرینگر: میزان پبلشرز، 2017، ص30)

بنیادی طور پر دیکھا جائے تو ہر انسان کے اعمال و رویے جبلت حیات کے تحت صادر ہوتے ہیں۔ عورت چونکہ فطری اور جذباتی طور پر کمزور ہوتی ہے۔ وہ ہر وقت سہاروں اور تحفظ کی طلب گار رہتی ہے۔ صفیہ کے رویے سے عورت کی نفسیات یوں مترشح ہوتی ہے کہ عورت میں جبلت ِحیات کی تمام تر جبلتیں، اشاعت ذات، تحفظ ذات اور احترام ذات موجود ہوتی ہے۔ صفیہ کا اشفاق سے والہانہ لگاؤ دراصل اسی جبلتِ تحفظ اور جبلتِ احترام ذات کی اثر پذیری کا نتیجہ ہے۔ دوسری طرف دیکھا جائے تو ازل سے ہی محبت عورت کی جبلی کمزوری رہی ہے۔ وہ جس بھی شخص سے ذہنی و نفسی مطابقت محسوس کرتی ہے اس کے لیے اپنا جسم اور روح قربان کرنے پر بھی آمادہ ہو جاتی ہے۔ صفیہ کا اشفاق سے ذہنی وابستگی کا احساس اس حد تک مضبوط اور پائیدار ہے کہ افضل سے شادی ہونے کے باوجود بھی وہ اس کو اپنے ذہن کے گوشوں سے فراموش نہیں کر پاتی۔ یہی جذبات واحساسات اس کے لاشعور کے متمکن ہو گئے جو کبھی بہاؤ میں آ کر شعور پر غالب آ جاتے ہیں۔ ان ہی احساسات اور جذبات کا آئینہ دار یہ اقتباس ملاحظہ ہو:

> "اس سے محسوس ہو رہا تھا کہ اس نے زندگی کی سب سے بڑی حقیقت پالی ہے۔۔۔۔ یہ لمحہ حقیقت ہے اور ماضی دھواں اور مستقبل غیر یقینی اور بے اصل۔۔۔۔ اشفاق کو دیکھ کر اس کی بے قرار متلاشی نگاہ کو سکون مل رہا تھا۔۔۔۔۔ اور وہ سوچ رہی تھی کہ صدیوں پہلے ان کے بدن سے جدا ہوئی ہے اور جب سے تنہائی کے صحراؤں میں بھٹکتی پھر رہی ہے اس کی روح پیاسی ہے، اس کے ہونٹ جل رہے ہیں۔۔"

(ایضاً، ص48)

اشفاق چونکہ بچپن سے ہی ماں کی ممتا سے محروم اور سوتیلی ماں کی متضاد شخصیت کی وجہ سے کئی نفسیاتی الجھنوں کا شکار رہا ہے۔ نفسیاتی لحاظ سے دیکھا جائے تو اشفاق کے رویے میں جو احساس محرومی، تذبذب، نفسیاتی و جنسی گھٹن، منتشر خیالی ہے وہ ان ہی نفسیاتی الجھنوں کا ثمرہ ہے۔ ذیل کے اقتباس سے اشفاق کے اس ذہنی و نفسی الجھاؤ کا اندازہ ہوتا ہے:

> "خون کے رشتے محض فراڈ، بکواس، آدمی عادتوں کا غلام ہے اور جب بھی اس کے اغراض کو زک پہنچنے کا احتمال ہوتا ہے عادتیں بھی پگھل کر رہ جاتی ہے اور عشق۔۔۔۔؟؟۔۔۔۔۔ عشق اگر دبے ہوئے جنسی جذبے کا اظہار نہیں تو کچھ بھی نہیں۔" (ایضاً، ص35)

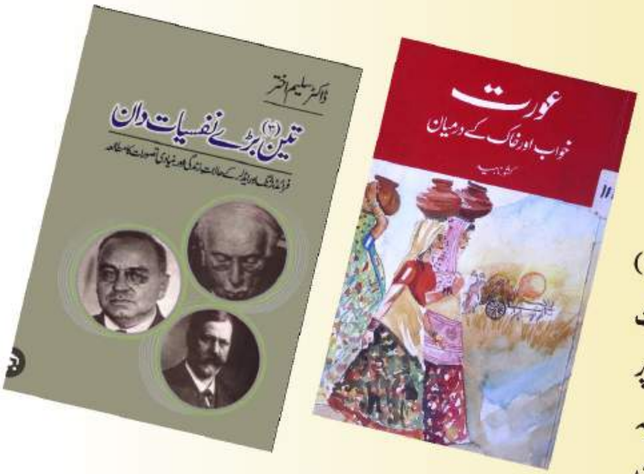

ایک اور جگہ اشفاق کے لاشعور میں پنہاں محرومی کی عکاسی یوں ہوتی ہے:

> "محبتیں اور نفرتیں بے معنی ہیں زندگی محض ایک سایہ ہے۔ ہر خیال سراب ہے کسی کو فرصت نہیں کہ آدمی کے اندر کے آتش کدے کو جھانک کر دیکھ لے کوئی کیوں دیکھے! زندگی نفس شاری ہے کوئی بے کار جیتا ہے۔۔۔ پیٹ کی بھٹی کھانا مانگتی ہے اور جسم جسم کا تعاقب کرتا ہے۔۔" (ایضاً، ص35)

دراصل صفیہ سے محبت اشفاق کے لاشعور میں پنہاں جذباتِ تحفظ کی کمی کے احساس کا ردعمل ہے جس سے وہ اپنی شخصیت کا خلا پر کرنا چاہتا ہے۔

بہر کیف کرداروں کی مذکورہ بالا تمام نفسی رویوں اور ردعمل کے ذریعے حامدی کاشمیری نے ہمارے معاشرے کے جیتے جاگتے انسانوں کی مختلف نفسیاتی گتھیوں کو سلجھانے کی کوشش کی ہے اور انسانی زندگی کا ایک بے رحم معاشرہ ہمارے سامنے پیش کیا ہے جہاں زندگی کی کوئی دلکش صورت نظر نہیں آتی بلکہ ہر طرف چلتے پھرتے سائے اور مسخ شدہ چہرے دکھائی دیتے ہیں۔

□□□

Sayima Jan
Research Scholar
Kashmir University
Hazratbal
Srinagar-190006 (Jammu & Kashmir)

راحیلہ تبسم

فارسی سے اردو میں ترجمہ شدہ چند داستانوں کا مختصر تعارف

بوستان خیال
جلد ششم

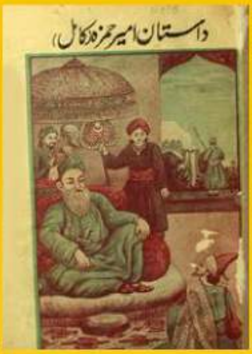
داستان امیر حمزہ کامل

توتا کہانی
مجلس ترقی ادب ○ لاہور

نوطرز مرصع
یعنی

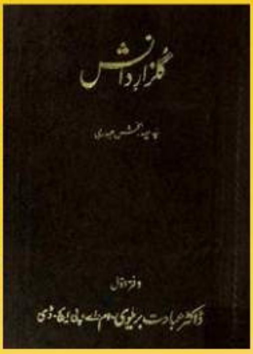
گلزار دانش
دفتر اول

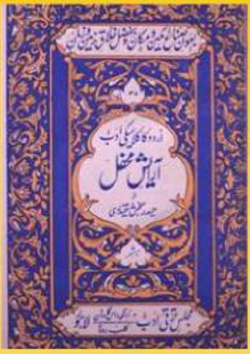
آرائش محفل
مجلس ترقی ادب

قدیم اور شاندار تہذیب و تمدن کے تحت ہندوستان اور ایران کے مابین تعلقات و روابط بہت ہی قدیم اور گہرے ہیں۔ سرزمین ہند میں فارسی تقریباً سات سو برس علمی و ادبی زبان رہی ہے لیکن بالخصوص اسے سرکاری زبان کی حیثیت مغل عہد کے ایک قابل قدر حکمران جلال الدین محمد اکبر کے دور حکومت میں حاصل ہوئی۔ فارسی زبان نے ہندوستان کی تہذیب و ثقافت اور علم و ادب کے ساتھ ساتھ یہاں کی مختلف زبانوں مثلاً اردو، ہندی، مراٹھی، کشمیری، راجستھانی، گجراتی اور پنجابی پر گہرے نقوش چھوڑے ہیں۔

برصغیر ہند میں اردو پر فارسی کے گہرے اثرات ہیں۔ اردو زبان و ادب کو فارسی زبان نے کافی حد تک متاثر کیا ہے اور یہ اسی زبان کے سایہ میں پروان چڑھی۔ اس نے (اردو نے) ترقی کی منزلوں تک پہنچنے کے لیے بہت سے مراحل فارسی زبان و ادب کے زیر سایہ طے کیے۔ فارسی نے اسکی ایسی آبیاری و سرپرستی کی کہ یہ پورے عالم میں اپنا ایک الگ مقام رکھتی ہے۔ اردو نثری اور شعری ادب کو کافی شہرت و مقبولیت حاصل ہے، جن لوگوں نے اردو شعر و ادب کو تخلیق کیا اس پر کام کیا ان کی اصلی زبان فارسی رہی ہے۔ انھوں نے فارسی ادبیات کو پڑھا، سمجھا اور پھر اسے اردو میں منتقل کیا۔ اردو کی تقریباً تمام اصناف پر فارسی کا اثر نمایاں ہے۔ اردو کے اوائل دور کے ادیبوں اور شاعروں نے فارسی اثرات کے تحت اردو شاعری اور ادب کی تخلیق کی۔

داستانوں کی تاریخ اردو میں زمانہ قدیم سے چلتی آئی ہے لیکن اردو ادب میں سب سے زیادہ فارسی اثرات اسکے ارتقائی سفر کی داستانوں میں نظر آتے ہیں۔ یہ داستانیں فارسی قصوں پر مشتمل ہیں ان قصوں کا فارسی سے اردو میں ترجمہ کیا گیا ہے۔ اردو ادب کے ابتدائی سفر کا آغاز دکن سے ہوتا ہے۔ اردو ادب میں فارسی داستانوں کو اردو کا جامہ سب سے پہلے والئی گولکنڈہ عبداللہ قطب شاہ کی فرمائش پر 1635 میں وہاں کے مشہور و معروف مصنف ملا وجہی نے پہنایا۔ انھوں نے ”سب رس“ جیسی مشہور و مقبول داستان قلمبند کر کے اردو ادب میں ایک نئے باب کا اضافہ کیا۔ اردو میں ترجمہ شدہ چند فارسی داستانوں کے متعلق ذیل میں مختصراً بیان کیا گیا ہے:

1۔ سب رس: ”سب رس“ اسداللہ ملا وجہی کی نثری تصنیف ہے۔ یہ داستان دراصل ایران کے ایک مشہور شاعر مرزا محمد یحیی ابن سیبک فتاحی نیشاپوری کی فارسی منظوم داستان ”دستور عشاق“ اور نثری قصے ”حسن و دل“ کا اردو ترجمہ ہے۔ ”سب رس“ کو اردو نثر کی پہلی داستان تسلیم کیا جاتا ہے اور سترہویں صدی کے اردو نثر میں اسے کافی مقبولیت حاصل ہوئی۔ اس داستان میں مصنف نے تمثیلی انداز میں حسن و عشق کے معرکے کو قصے

کی صورت میں بیان کیا ہے۔ اس کا طرز بیان مرصع و مسجع ہے۔ اس میں عربی وفارسی کے ساتھ ساتھ ہندی الفاظ بھی شامل ہیں۔

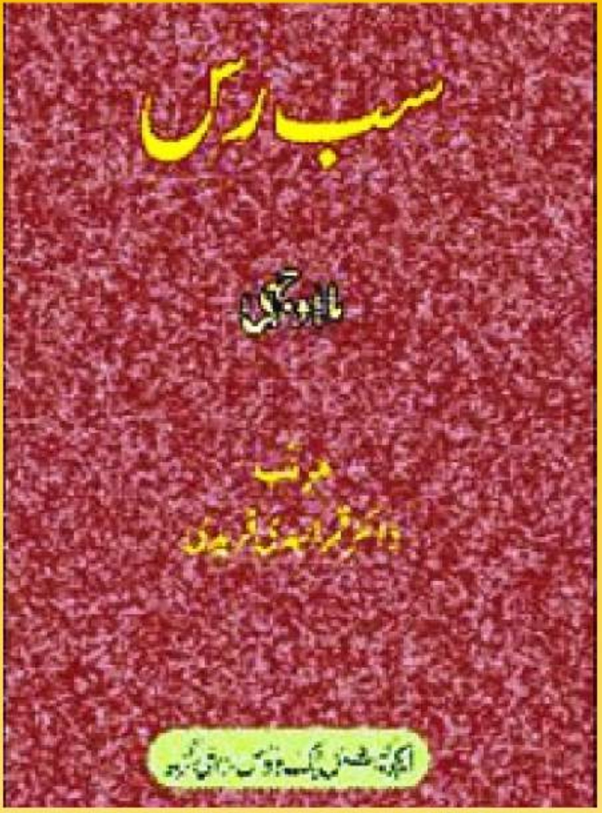

2۔نوطرز مرصع: دوسری مشہور داستان ”نوطرز مرصع“ ہےاس کے مصنف کا نام میر محمد حسین عطا خان تحسین ہے۔ یہ داستان فارسی کے قصہ ”قصہ چہار درویش“ کا اردو ترجمہ ہے۔ تحسین کو اردو اور فارسی دونوں زبانوں میں کافی مہارت حاصل تھی۔ وہ ایک خوشنویس بھی تھے انہیں ”مرصع رقم“ کا خطاب حاصل تھا۔ نوطرز مرصع کا شمار اٹھارویں صدی کی اہم داستانوں میں ہوتا ہے یہ 1775 میں لکھی گئی۔ اس داستان میں مصنف نے فارسی آمیز الفاظ وتشبیہات کا استعمال کیا ہے۔ مصنف نے اس داستان کوتحریر کرنے کی وجہ بھی بیان کی ہے جس کو مولوی عبدالحق نے اپنی کتاب ”باغ و بہار یعنی قصہ چہار درویش مولفہ میر امن دہلوی مع مقدمہ و فرہنگ“ میں اسطرح نقل کیا ہے:

”نوطرز مرصع کی تالیف کا سبب انھوں نے یوں بیان کیا ہے کہ ایک مرتبہ نواب مبارز الملک افتخار الدولہ جنرل اسمتھ بہادر صولت جنگ سالار فوج انگریزی کی ہمراہی میں بجرے پر کلکتہ کا سفر پیش آیا۔ خالی بیٹھے بیٹھے دل گھٹنے لگا تو ایک عزیز نے جو ہمراہ تھا، یہ قصہ سنانا شروع کیا۔ بہت پسند آیا اور اسی وقت سے زبان ہندی میں لکھنے کی دھن ہوگئی۔ کیونکہ سلف میں کوئی شخص موجد اس ایجاد تازہ کا نہ ہوا۔ چناں چہ اسی خیال سے لکھنا شروع کیا۔“ (ص2،3)

نوطرز مرصع کی زبان دقیق اور گنجلک ہے۔ اس داستان کا شمار شمالی ہند کی قدیم نثری داستانوں میں ہوتا ہے۔

3۔داستان امیر حمزہ: یہ بھی فارسی داستان کا اردو ترجمہ ہے۔ اس میں امیر حمزہ کی مہمات کا ذکر ہے یہ شخص خلیفہ ہارون رشید کے زمانے کا تھا۔ 1801 میں داستان امیر حمزہ کو پہلی بار ڈاکٹر جان گلکرسٹ کی فرمائش پر خلیل علی خان اشک نے آسان اردو میں ترجمہ کیا۔ اردو ادب میں اس داستان کو کافی شہرت ومقبولیت حاصل ہوئی۔ اس میں ایران اور ہندوستان کے رسم و رواج کا اختلاط نظر آتا ہے۔ یہ داستان چار دفتر اور اٹھاسی داستانوں پر مشتمل ہے۔ اسکا اسلوب بیان سادہ اور رواں ہے۔

4۔ بوستان خیال: ”بوستان خیال“ میر محمد تقی کی فارسی داستان ہے۔ اس کا شمار ان طویل مقبول داستانوں میں ہوتا ہے جنہیں ہر زمانے میں شوق سے پڑھا جاتا رہاہے۔ یہ داستان امیر حمزہ کا جواب ہے۔ 1840 میں اس داستان کو عالم علی نے ”زبدۃ الخیال“ کے نام سے اردو میں منتقل کیا۔ اسکے کئی ترجمے ہوئے سب سے اہم ترجمہ خواجہ امان کا ہے۔

5۔آرائش محفل: اس کے مصنف کا نام حیدر بخش حیدری ہے۔ یہ فارسی کی داستان ”حاتم طائی“ کا اردو ترجمہ ہے۔ اس میں حاتم طائی کے خیالی سفروں کی کہانی درج ہیں۔ 1801 میں اسے عام سہل زبان میں تحریر کیا گیا۔ اس میں مصنف نے قصہ کو بڑھا کر دلچسپ انداز میں پیش کیا ہے۔ یہ داستانوی خصوصیات کی بنا پر مصنف کی مشہور ومعروف تصنیف ہے۔ اس داستان کے متعلق پروفیسر گیان چند جین نے اپنی تصنیف ”اردو کی نثری داستانیں“ میں اس طرح لکھا ہے:

> ”آرائش محفل کی کہانیوں میں قصہ در قصہ پیچیدگی پیدا کی گئی ہے۔ قصے میں جو شاخ در شاخ نکل آتی ہے اس کا مرکزی پلاٹ سے کوئی تعلق نہیں ہے“(ص،311)

حیدری نے اس داستان کے آخر میں ایک قطعہ بھی لکھا ہے جو اس طرح ہے:

اس قصہ پر لطف کے اتمام کی تاریخ
میں دل میں سمجھتا تھا نہایت ہی ہے مشکل
کر دور سریاس کہا پیر خسرو نے
کیوں کر نہ کہیں ہم اسے آرائش محفل

داستان ”حاتم طائی“ کا ترجمہ ”تحفت سیر حاتم“ کے نام سے مہمان

نامی شاعر نے کیا ہے۔

6۔ توتا کہانی: یہ 35 کہانیوں پر مشتمل حیدر بخش حیدری کی تصنیف ہے۔ یہ ضیا الدین نخشبی کی فارسی داستان ''طوطی نامہ'' کا اردو ترجمہ ہے۔ مصنف نے اسے عام بول چال کی زبان میں تحریر کیا۔ اس سے پہلے دکنی زبان میں اسکا ترجمہ سید محمد قادری نے ''طوطی نامہ'' کے نام سے کیا تھا۔ ''توتا کہانی'' کو ڈاکٹر جان گلکرسٹ کی فرمائش پر 1801 میں تحریر کیا گیا۔ اس داستان کا تحریر بیان سادہ وسلیس ہے۔

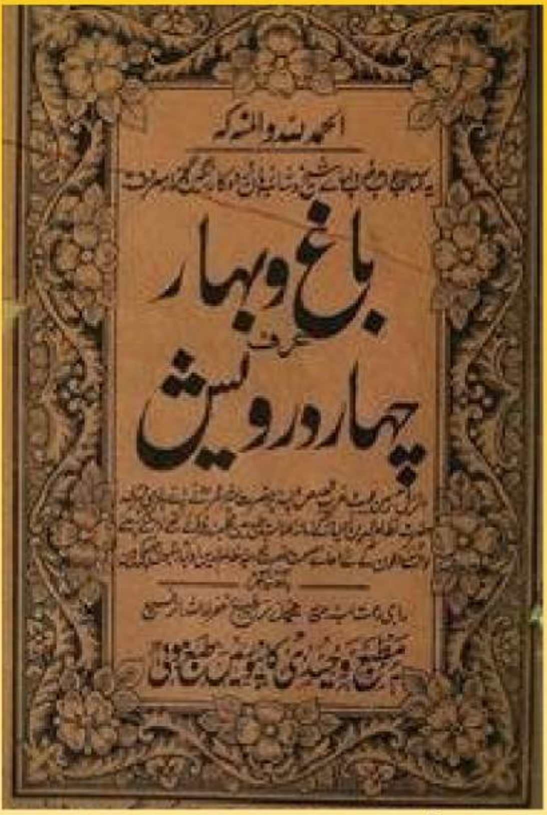

الحمد للہ والمنۃ کہ

باغ وبہار

عرف

چہار درویش

8۔ باغ و بہار: یہ فارسی کے قصہ ''قصہ چہار درویش'' کا اردو ترجمہ ہے۔ اس داستان کو میر امن نے 1802 میں ڈاکٹر جان گلکرسٹ کی فرمائش پر آسان اردو میں ترجمہ کیا۔ اس کو تصنیف کرتے وقت مصنف نے ''قصہ چہار درویش'' کے ساتھ ''نوطرز مرصع'' کو بھی پیش نظر رکھا تھا۔ اس کا شمار اردو کی لازوال داستانوں میں ہونے کے ساتھ ساتھ اردو نثر کی عام بول چال کی زبان میں لکھی جانے والی اولین درجہ کی کتابوں میں ہوتا ہے۔ یہ داستان اردو نثر میں ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہے اور اسے بجا طور پر جدید اردو نثر کا پہلا صحیفہ مانا گیا۔ اس داستان کی اشاعت کے بعد اردو نثر میں پہلی مرتبہ سلیس اردو زبان اور آسان عبارت آرائی کا دور شروع ہوا۔ یہ قصہ چہار درویش اور ایک بادشاہ کی زندگی کے مختلف نشیب وفراز کی داستان ہے جس میں قصہ درقصہ داستان آگے بڑھتی ہے۔ جس کے بیان میں انسانی اقدار کے ساتھ ساتھ مافوق الفطرت عناصر کی شمولیت بھی ہے۔

''باغ وبہار'' بے مثل طرز بیان، سلیس نگاری اور فصیح زبان کی وجہ سے مقبولیت کی حامل ہے۔ فورٹ ولیم کالج کی تصانیف میں اسکو سب سے زیادہ پسند کیا گیا۔

8۔ گلزار دانش: اس کے مؤلف کا نام حیدر بخش حیدری ہے۔ یہ فارسی کی داستان ''بہار دانش'' کا اردو ترجمہ ہے۔ ''بہار دانش'' شیخ عنایت اللہ نے ۱۶۵۱ء میں لکھی۔ یہ ایک عشقیہ داستان ہے اس میں جہاندار شاہ اور بہرور بانو کے عشق کی داستان کو نثری انداز میں تحریر کیا گیا ہے۔ حیدر بخش حیدری نے اسکے اردو ترجمہ میں بعض جگہوں پر فارسی ترکیب نحوی کا استعمال کیا ہے۔ اس داستان کا ایک منظوم ترجمہ مرزا جان طپش نے ''بہار دانش'' کے نام سے کیا۔

ان کے علاوہ اور بھی کئی فارسی داستانوں کو اردو نثر ونظم میں ترجمہ کیا گیا جو رفتہ رفتہ بہت مشہور ومقبول ہوئیں جیسے شیریں فرہاد کا قصہ، بہرام گور کا قصہ، لیلی مجنوں، گل مغفرت، خسروان عجم، الف لیلہ، قصہ گل بکاولی اور بہرام گل اندام وغیرہ۔ غرض اسی طرح سے ایرانی عناصر اردو میں داخل ہوئے اور اس زبان کی رگوں میں سمو گئے۔

ماخذ:

1 اردو ادب کی تنقیدی تاریخ، پروفیسر احتشام حسین

2 تاریخ ادب اردو، ڈاکٹر نورالحسن نقوی

3 اردو کی نثری داستانیں، پروفیسر گیان چند

4 تاریخ ادب اردو جلد سوم، ڈاکٹر جمیل جالبی

5 اردو نثر کا تنقیدی مطالعہ، ڈاکٹر سنبل نگار

6 اردو داستان، ڈاکٹر سہیل بخاری

7 باغ و بہار یعنے قصہ چہار درویش مولفہ میر امن دہلوی مع مقدمہ وفرہنگ مرتبہ مولوی عبدالحق

8 فرہنگ بوستان خیال، ڈاکٹر اکبر حسین قریشی

9 نوطرز مرصع، میر محمد حسی عطا خان تحسین

Raheela Tabassum
Research Scholar
Resident of Begum Azeezun Nisa Hall,
Aligarh Muslim University
Aligarh-202001 (U.P)

مسائل نسواں

شبینہ بانو

ہندوستان کے زرعی شعبے میں دیہی خواتین کا اہم کردار

آزادی کا امرت مہوتسو منا رہے نئے ہندوستان میں خواتین سماجی اقتصادی اور ماحولیاتی تبدیلیوں کے لیے مشعل بردار ہیں۔ ملک میں معاشی طور پر کام کرنے والی دیہی خواتین میں سے تقریباً 80 فیصد زراعت سے وابستہ ہیں۔ زراعت میں دیہی خواتین کی قوت کو بااختیار بنانا اور مرکزی دھارے میں لانا ملک کو معاشی ترقی کی طرف لے جانے میں ایک اہم ہتھیار ہوگا، کیونکہ اس سے خوراک اور غذائی تحفظ میں اضافہ ہوگا، غربت اور بھوک میں کمی آئے گی اور قابل ترقی کے حصول کے لیے بہتر حکمت عملی ہوگی۔

ہندوستان آزادی کے 75 سال پورا کر چکا جس کو آزادی کا امرت مہوتسو کے روپ میں منایا گیا اور اس موقع پر مضبوط خواتین بااختیار ملک (strong women strong nation) مہم کا آغاز بھی کیا گیا۔ ہندوستان ایک زرعی معیشت کا ملک ہے 2011 کی مردم شماری کے مطابق ملک کی کل افرادی قوت کا تقریباً 65.4 فیصد زراعت اور اس سے منسلک سرگرمیوں میں مصروف ہے وزارت شماریات 2017 کے اعداد و شمار کے مطابق شہروں میں 35.31 فیصد کے مقابلے دیہی علاقوں میں افرادی قوت میں خواتین کا حصہ 41.8 فیصد ہے پچھلے کچھ سالوں سے ہندوستان میں اصلاحات خواتین کی مجموعی ترقی پر توجہ مرکوز ہو رہی ہے تاکہ وہ سماجی اقتصادی اور صحت کی حفاظت حاصل کر سکے۔ آزادی کے بعد سے معاش کے مواقع پیدا کر کے اور بامعاوضہ روزگار میں حصہ لے کر دیہی خواتین کی حیثیت کو بہتر بنانے کے لیے پچھلے کچھ سالوں سے بڑی سرکاری اسکیمیں اور پروگرام شروع کیے جارہے ہیں۔. خواتین کسانوں کے عظیم کردار کے پیش نظر، 15-12-2016 کو انڈین کونسل آف ایگریکلچرل ریسرچ، نئی دہلی کی اتھارٹی کی منظوری سے فیصلہ کیا گیا ہے کہ ہر سال 15 اکتوبر 2017 سے "خواتین کسانوں کا دن" منایا جائے گا۔ تمام آئی سی اے آر، ادارے، زرعی یونیورسٹیاں اور کرشی وگیان کیندر 2017 سے اس پروگرام کو ترتیب دے کر "خواتین کسان دن" منا رہے ہیں جس میں مباحثہ، مضمون نگاری اور ڈرائنگ مقابلہ، زراعت میں خواتین کا کردار، خواتین کو بااختیار بنانے، غذائیت اور آمدنی پیدا کرنے جیسے موضوعات پر نمائش کی جاتی ہے اور اس موقع پر خواتین کو اعزاز بھی دیا جاتا ہے۔ ہندوستانی حکومت نے خواتین کے لیے زیادہ جامع اور محفوظ ماحول پیدا کرنے کے لیے یہ سارے اقدامات کیے ہیں یہ سب اسکمیں نہ صرف مدد اور وسائل فراہم کرتی ہیں بلکہ خواتین کے اندر بیداری کو بھی فروغ دیتی ہیں وزیراعظم کا روزگار پیدا کرنے کا پروگرام، قومی دیہی روزی روٹی مشن، دین دیال گرامین کوشلیا یوجنا، پردھان منتری وندنا یوجنا، بیٹی بچاؤ بیٹی پڑھاؤ، اجولا اسکیم، راجیو گاندھی نیشنل کریچ اسکیم، مہلا شکتی کیندراس، سپورٹ ٹو ٹریننگ اور ایمپلائمنٹ پروگرام فار وہ من، سودھار گرھ، مہلا پولیس والنٹیئر اسکیم، اومن ہیلپ لائن اسکیم، ورکنگ ومن ہاسٹل اسکیم یوجنا وغیرہ اسکیموں اور پروگراموں نے ملک میں خواتین کو مردوں کے برابر لانے اور ان کو سماجی اور معاشی طودر پر مظبوط بنانے میں اہم کردار ادا

کیا ہے۔ موجودہ دور میں دیہی خواتین حکومت کی فلاحی اسکیموں کے ذریعے تعلیمی وسائل کی پیداواری صلاحیت کی تعمیر، ہنر مندی کی ترقی، صحت کی سہولیات اور معاش کے طریقوں تک رسائی حاصل کرنے میں کامیاب ہورہی ہیں اور معاشرے میں خواتین کے فعال شرکت کی حوصلہ افزائی بھی کرتی ہیں۔

زرعی شعبے میں دیہی خواتین کی افرادی قوت:(Rural women workforce in agriculture sector)

"وانگلشی کے مطابق پودوں اور جانوروں سے پیدا ہونے
والی مصنوعات کے حصول کے لیے کی جانے والی انسانی
کوشش کوزراعت کہا جاتا ہے۔"

زراعت کی شروعات ہزاروں سال پہلے سے ہوئی ہے اور خواتین نے شروعات سے ہی اس شعبہ میں اہم کردار نبھایا اس زمانے میں بھی جب مرد حضرات شکار پر چلے جاتے تو خواتین بچوں کی ذمہ داری کے ساتھ ساتھ کھیتی باڑی کی بھی ذمے داری سنبھالتی تھیں۔ ہندوستان ایک زراعت سے مالا مال ملک ہے زراعت اور اس سے منسلک شعبے دیہی برادریوں میں روزی روٹی کا بنیادی ذریعہ ہیں۔ دیہات میں 40 فیصد معاشی طور پر خواتین اس شعبے سے جڑی ہیں ان میں سے 32 فیصد زرعی مزدور ہیں اور باقی خود روزگار کسان ہیں۔ دیہی خواتین زراعت میں پیداواری صلاحیت کو بڑھانے کے لیے پیداوار کٹائی سے پہلے اور فصل کے بعد کی پروسیسنگ پیکجنگ اور مارکیٹنگ سمیت پوری ویلیو چین میں سرگرم رہتی ہیں زرعی شعبے کے پیداوار میں اضافے کے ساتھ ساتھ کام کرنے والی خواتین کا تناسب مردوں کے مقابلے میں بڑھا ہوا ہے۔ فوڈ اینڈ ایگریکلچر آرگنائزیشن نے خواتین کی آبادی کے ایک اہم گروپ کے طور پر شناخت کیا ہے ان کے مطابق ایسی اصلاحات، جو خواتین کو وسائل تک مساوی رسائی مہارت کی ترقی اور مواقع فراہم کرتی ہیں ترقی پذیر ممالک میں زرعی پیداوار میں 2.5 فیصد سے 4 فیصد تک کا اضافہ کرا سکتی ہیں۔

(بحوالہ ہندوستانی زراعت ریسرچ کونسل 18-2017 خواتین کے کام کرنے کا اعداد و شمار)

نمبرشمار	خواتین کی شراکات	فیصد
1	اہم فصلوں کی پیداوار میں خواتین کی حصہ داری	75
2	باغبانی میں خواتین کی حصہ داری	79
3	فصل کی کٹائی میں خواتین کی حصہ داری	51
4	مویشی پالن اور متس پالن میں خواتین کی حصہ داری	95

ایک تحقیق کے مطابق بیلوں کی ایک جوڑی 1064 گھنٹے، ایک مرد 1212 گھنٹے اور ایک عورت 3485 گھنٹے بھارتی ہمالیہ کے ایک ہیکٹر فارم پر ایک سال میں کام کرتی ہے۔ یہ اعداد و شمار زرعی پیداوار میں خواتین کی نمایاں شراکت کو اجاگر کرتا ہے۔ آگاہ رہیں کہ 1 سال میں 8760 گھنٹے ہوتے ہیں۔ یعنی خواتین روزانہ اوسطاً 9.55 گھنٹے کام کرتی ہیں جو کہ سال کا 39.78 فیصد ہے۔ اس سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ خواتین مردوں کے مقابلے میں تقریباً 3 گنا زیادہ کام کرتی ہیں۔ (ڈاکٹر سدھا نند پرساد لال اور ڈاکٹر راجیو کمار سریواستو)

خواتین کو زراعت کے مرکزی دھارے میں لانے کی کوششیں:

ہندوستان کے وزیراعظم کے خود کفیل بھارت (آتم نربھر بھارت) کے وژن کے مطابق مرکزی حکومت نے صنفی مساوات کے جھنڈے کو ترجیح دی جس کا مقصد زراعت اور اس سے منسلک شعبوں میں مصروف دیہی خواتین کو وسائل اور اسکیموں تک رسائی فراہم کرانا ہے۔ آتم نربھر بھارت کے تحت زراعت کی ترقی میں مصروف خواتین کو مرکزی دھارے میں لانے اور دیہی خدمات میں انھیں معمول کی زندگی دینے کے لیے فنڈز بھی مختص کیے گئے ہیں۔ محکمہ زراعت اور کسانوں کی بہبود میں دیہی خواتین کو قومی دھارے میں لانے کے لیے خصوصی اسکیمیں شروع کی ہیں۔ ان خصوصی اسکیموں کے تحت ریاست اور دیگر نافذ کرنے والی ایجنسیوں کو کم از کم 30 فیصد خواتین کسانوں پر خرچ کرنا ہوگا۔ زراعت اور کسانوں کی بہبودی کے لیے وزارت کی طرف سے ہنر مندی کی نشو و نما اور خواتین کسانوں کی صلاحیتوں میں اضافے کے لیے کئی تربیتی پروگرام چلائے گئے ہیں۔ مرکزی حکومت زرعی توسیع کے ذیلی مشن کے تحت ریاستوں کے پروگراموں اور اصلاحات کی حمایت کررہی ہے۔ قومی تربیتی اداروں، ریاستی زرعی انتظام اور توسیعی تربیتی اداروں، کرشی وگیان کیندروں اور ریاستی زرعی یونیورسٹیوں کے ذریعے ملک بھر میں خواتین کسانوں کے لیے زراعت اور اس سے منسلک شعبوں میں کم از کم 200 گھنٹے کے ہنر کے کورسز چلائے جارہے ہیں۔ اس کے معاون اقدامات میں اضافے کے ساتھ، ملک میں خواتین آپریٹ ہولڈنگ کی تعداد 2010-11 میں 12.78 فیصد سے بڑھ کر 2015-16 میں 13.78 فیصد ہوگئی۔ وزارت کی مدد سے ملک میں کئی گروپ کسان خواتین کے تحفظ کے لیے کام کررہے ہیں۔ وہ زراعت میں مصروف خواتین سے متعلق اہم شعبوں میں تحقیق اور بڑے پیمانے پر مطالعہ کررہے ہیں۔ یہ گروپ تربیتی پروگراموں کے ذریعے صنفی حساسیت کو بڑھانے کے علاوہ خواتین کے

دوستانہ وسائل اور ٹیکنالوجی کی تالیف اور دستاویزات تک رسائی میں اہم کردار نبھا رہے ہیں۔ دیہی خواتین کی افرادی قوت میں شمولیت حوصلہ افزائی حفاظت، تحفظ، صحت، تعلیم، ہنرمندی کی ترقی اور بااختیار بنانے کے ذریعے کی جاسکتی ہے۔ جنسی تناسب کو بہتر بنانا اور لڑکیوں کی جنین کی روک تھام خواتین کو بااختیار بنانے کی طرف پہلا قدم ہے۔ ''بیٹی بچاؤ بیٹی پڑھاؤ'' یوجنا نے خواتین کے خلاف امتیازی سلوک کو ختم کرنے اور جنسی تناسب کو بہتر بنانے کے لیے اجتماعی طور پر متحرک کیا ہے۔ سوکنیا سمردھی یوجنا کے تحت بچیوں کے حقوق اور اس کی اعلیٰ تعلیم کے مواقع کو فروغ دیا گیا ہے۔ خواتین اور بچوں کی ترقی کی وزارت کے پاس خواتین کو مجموعی طور پر بااختیار بنانے اور بچوں کی ترقی کے لیے ملک بھر میں کئی اسکیمیں ہیں۔ ہندوستان نے دیہی علاقوں میں بینکوں کی رسائی کو بڑھانے کے لیے ایک اہم قدم اٹھایا ہے۔ 'پردھان منتری جن دھن یوجنا' کے ذریعے مالی شمولیت اور بینکنگ خدمات تک بہتر رسائی سے دیہی خواتین کی معاشی سرگرمیوں میں شرکت کا امکان مضبوط ہو جاتا ہے۔ جن دھن ابھیان نے دیہی خواتین کو سیونگ، انشورنس اور پنشن جیسی مالی خدمات تک رسائی کو یقینی بنایا ہے جو خواتین میں خود اعتمادی اور معاشی سرگرمیوں کی طرف لے جانے میں اہم قدم ثابت ہوگا۔

جن دھن ابھیان نے دیہی خواتین کی مالی خدمات جیسے بچت اور جمع کھاتوں، ادائیگیوں، قرضوں، بیمہ پالیسیوں اور پنشن تک رسائی کو یقینی بنایا ہے۔ مالی شمولیت کے ان اقدامات سے لین دین میں شفافیت آئی ہے۔ حکومت ہند کی مختلف اسکیموں میں براہ راست فوائد کی منتقلی کی سہولت کے ساتھ، فائدہ اٹھانے والوں کو وقت پر رقم مل جاتی ہے۔ وزارت خزانہ کے تازہ ترین اعداد و شمار کے مطابق سات سالوں میں اس اسکیم کے تحت ملک میں 43.04 کروڑ بینک اکاؤنٹس کھولے گئے ہیں۔ ان میں سے 55.47 فیصد یعنی 23.87 کروڑ اکاؤنٹس خواتین کے ہیں۔ کل 66.69 فیصد یعنی 28.70 کروڑ اکاؤنٹس دیہی اور نیم شہری علاقوں کے رہائشوں کے ہیں۔

مالی شمولیت کی وجہ سے، کووڈ-19 کے پھیلنے کے دوران بھی گاؤں والوں کو بلاتعطل مالی امداد فراہم کی جاسکی ہے اور دیہی آبادی کو اس عالمی وبائی مرض سے پیدا ہونے والے بحران سے نکلنے میں مدد ملی ہے۔ اسٹینڈاپ این انڈیا اور وزیراعظم پردھان منتری مدرا یوجنا، وزیراعظم ایمپلائمنٹ جنریشن پروگرام جیسی اسکیموں اور پروگراموں نے بھی دیہی خواتین کو مالی طور پر بااختیار بنانے اور ان کی کاروباری ترقی میں مدد کی ہے۔

عالمی صنفی عدم مساوات انڈیکس رپورٹ 2022 میں ہندوستان کی کارکردگی میں معمولی بہتری آئی ہے۔ یہ 2018 میں 0.625 کے مقابلے 2020 میں 0.629 تک پہنچ گیا ہے۔ ہندوسان کا مقام 146 ملکوں میں سے 135ویں (indian express) ورلڈ اکنامک فورم کی سالانہ جینڈر گیپ رپورٹ، 2023 کے مطابق، صنفی برابری کے لحاظ سے ہندوستان 146 مما لک میں سے 127 ویں نمبر پر ہے- پچھلے سال سے آٹھ مقامات کی بہتری ہوئی۔ خواتین کو معاشی سرگرمیوں کے

مرکزی دھارے میں شامل کرنے سے اقوام متحدہ کے پائیدار ترقی کے اہداف کے حصول میں مدد ملے گی۔ صنفی مساوات کا فروغ اور حکومتی اسکیموں اور پروگراموں تک خواتین کی رسائی زراعت کے شعبے میں ان کی شرکت کا باعث بنے گی۔ اس سے غربت اور بھوک کے خاتمے میں مدد ملے گی اور ملکی معیشت بہتر ہوگی۔ دیہی خواتین کے لیے اسکیموں میں مناسب سرمایہ کاری اور کمیونیٹی کی سطح پر بڑھ چڑھ کر حصہ لینے سے مستقبل کے بہتر امکانات کے لیے ان کو بااختیار بنانے میں تیزی آئے گی۔ ہنر کی ترقی اور تعلیم، صحت کی دیکھ بھال اور ڈیجیٹل ماحول تک رسائی دیہی خواتین کی زندگیوں میں اہم کردار ادا کرسکتی ہے۔ زراعت کی نئی ٹیکنالوجیز کی مناسب تربیت اور صلاحیت سازی سے خواتین کسانوں کو مدد ملے گی۔

نتیجہ (Results):

خواتین کاشتکاروں کا مدر ہاؤس وائف پروڈیوسر اور صنعت کار کے طور پر کثیر جہتی کردار ہے خواتین کے لیے ایک کثیر جہتی ٹیکنالوجی کا نقطہ نظر اپنانا بہت ضروری ہے سائیکو اسپیس۔ اس کے ذہنی میک اپ اور رویے سے متعلق اس کے گھر اور معاشرے سے منسلک، سماجی جگہ۔ اس کے پیداواری پہلو سے متعلق، ٹیکنو اسپیس اور ایکو اسپیس کریڈٹ کے پہلو سے متعلق ہے۔

دیہی خواتین ترقی پذیر ممالک کی معاشی زندگی میں سب سے زیادہ خاموش حصہ لینے والی خواتین ہیں جو غربت کی وجہ سے خواندگی، تنگدستی اور تھکاوٹ کی مختصر زندگی سے بچنے کے ذرائع سے محروم ہیں۔ دیہی خواتین کی شمولیت کے بغیر کامیاب ترقی کو آگے نہیں بڑھایا جاسکتا جو انہیں افادیت انسانی وسائل کے تحت کم پیداواری ذہنی ملازمت کی طرف مائل کرتی ہے اور اس سے ترقی کا عمل رک جاتا ہے اس لیے ضرورت اس بات کی ہے کہ ان کی کام کی حالت میں بہتری لائی جائے۔ پیداواری وسائل تک رسائی اور فیصلہ سازی میں ان کی شراکت کرائی جائے اور منصوبوں کے فیصلوں میں خواتین کی شمولیت کی مساوات کی طرف پیش رفت ضروری ہے۔

دیہی خواتین آزادی کے 75 ویں سال میں نئے ہندوستان کے لیے زرعی شعبے کی ترقی میں کلیدی شراکت دار ہیں۔ ان کی شمولیت کے بغیر کامیاب ترقی کو آگے نہیں بڑھایا جاسکتا۔ اس لیے ضرورت اس بات کی ہے کہ ان کی کام کی حالت میں بہتری لائی جائے پیداواری وسائل تک رسائی اور فیصلہ سازی میں ان کی شرکت کی جائے۔ دوسرے لفظوں میں پیداوار میں خاطر خواہ ترقی حاصل کرنے کے لیے ہر سطح پر کام کرنا جزوی طور پر خواتین پر منحصر ہے اور منصوبوں کے فیصلوں میں خواتین کی شمولیت کی مساوات کی طرف پیش رفت وسائل، ٹیکنالوجی، تعلیم، صحت کی سہولیات، مالکانہ حقوق اور ہنرمندی کی ترقی تک رسائی کو یقینی بنا کر دیہی خواتین کو قومی دھارے میں لایا جاسکتا ہے۔ اس سے زراعت کی پیداواری صلاحیت میں اضافہ ہوگا اور ایک مضبوط قوم کی تعمیر میں مدد ملے گی۔

چیلنجز (Challenges):

ترقیاتی کاموں میں حصہ لینے کے لیے خواتین کے مخصوص فیصد کو نشان زد کرنے کے ساتھ ساتھ اس پر عمل درآمد میں بھی چیلنجز درپیش ہیں کیونکہ پالیسی سازی کا قانون بنانے کے بعد بھی 30 فیصد کا ہدف پورا نہیں ہو رہا۔ قوانین، قواعد، دفعات اور رہنما خطوط کی تعمیل میں مزید لچک ضروری ہے۔ دیہی خواتین کی محنت کے سلسلے میں، ضروریات کی اہمیت اور ان پر کام کا بوجھ، قانون، قواعد وضوابط اور ہدایات پر عمل کرنے میں لچک اور حساسیت ضروری ہے۔ شرکت کے اہداف کو پورا کرنے میں بہت سی مشکلات ہیں، کیونکہ خواتین کاشتکاروں کی مہارتوں اور صلاحیتوں کو فروغ دینا ضروری ہے، نہ کہ تعداد اور اعداد وشمار کو ہدف کے طور پر۔ نئی حکمت عملی کے تحت اہداف پر عمل درآمد کو یقینی بنایا جائے گا، تبھی ہم ان کے نتائج خواتین کسانوں، ایف پی اوز اور زرعی اسٹارٹ اپس کے مفاداتی گروپس کی صورت میں دیکھیں گے۔

تجاویز (Suggestions):

1۔ خواتین میں تعلیمی بیداری پیدا کرنا، جس سے حکومت کے ذریعہ فراہم کی جانے والی سہولیات تک رسائی ممکن ہوسکے۔
2۔ فیصلہ سازی میں خواتین کی شراکت زیادہ سے زیادہ ہونی چاہیے۔
3۔ وسائل کی خدمات اور ٹیکنالوجی تک خواتین کی رسائی کو بہتر بنانا ہوگا۔
4۔ ملکیت کے حقوق میں جو ناانصافی ہے اس پر بھی حکومت کی توجہ مرکوز ہونی چاہیے۔

□□□

Shabeena Bano
Research Scholar
Dept. of Economics
MANUU,
Gachibowli
Hyderabad-500032(Telangana)

بشریٰ خاتون

نظم

دھوپ جب دستک دیتی ہے

کہر میں ڈوبی ایک صبح
مری کھڑکی سے
دھوپ جب دستک دیتی ہے
مرے دوست
مجھے تم یاد آتے ہو
تمھارے احساس کی گرمی
اور اس دھوپ میں جو مشابہت ہے
وہ ایک سرد دن کو بھی گوارا بنا دیتی ہے
رات جب گہری ہوتی ہے
فضا میں صرف خاموشی کی صدا رہ جاتی ہے
اور ہمارے ساتھی
زندگی کی رفتار میں
قدم بڑھاتے ہوئے
کسی اندھے موڑ پر تنہا چھوڑ کر
آگے نکل جاتے ہیں
مرے دوست
مجھے تم یاد آتے ہو
مجھے تم یاد آتے ہو کیونکہ یہاں
کوئی نہیں پڑھ سکتا آنکھوں کی عبارت
کوئی نہیں جان سکتا خاموش مکالمے کا ہنر
کوئی نہیں بن سکتا خاموشی کی صدا
اور کوئی نہیں اٹھا سکتا بھیگی ہوئی لکڑیوں کا بار

Dr. Bushra Khatoon
Dept.of Urdu
K.S.Saket P.G. College,
Ayodhya-224123 (U.P)

نظمیں

آبگینہ عارف

سانس

وہیں سے سوال
وہیں سے جواب
وہیں سے کہنا
وہیں سے سننا
وہیں پہ ساری باتیں ہیں
وہیں پہ سارے پتھر
وہیں پہ صحرا
وہیں پہ سراب
وہ جو دنیا تمھاری ہے
وہی میری بھی ہے 'جاناں'
جہاں پہ سردمہری ہے
وہیں آگ بھی ہے باقی
جو آنکھوں کے صحرا ہیں
وہ بے آب ہیں کب سے؟
بس ایک خودفریبی ہے
جسے میں جیتا رہتا ہوں
اک زنجیر ہے میری
اسے میں کستا رہتا ہوں
وہیں 'تو' جب سانس لیتا ہے
مجھے بھی سانس آتی ہے

جلتی ریت پہ

سبز قدم
کبھی جلتے
کبھی بجھتے ہوئے
آب گر آب کو محسوس ہوا
پاؤں کے چھالے رستے ہوئے
گہرے نشاں
براہ راست
مجھے کیوں دکھائی دیتے ہیں
اسے کچھ بھی نہیں معلوم
کہ چند ریت میں
بہہ گیا ہوگا
کب سورج پانی پہ تیرتا ہوا
کوئی جنبش نہیں
کوئی محور نہیں
میں روز کھودتا ہوں
روز پاٹ دیتا ہوں
یہ کون ہے جو
میرے جیسا ہے

Ms. Abgeena Arif
C-5, 3 rd Floor
Jasola Village
New Delhi-110025

خیرالنساء علیم

اور جب نمودِ سحر مسکرا اُٹھی

تانیہ اور نغمہ دونوں بچپن کی سہیلیاں تھیں، اسکول کی تعلیم ختم ہوئی تو کالج میں بھی دونوں نے ایک ساتھ ایڈمیشن لیا تھا چونکہ دونوں کا گھر بھی قریب قریب ہی تھا...... اس لیے کالج جانے کے لیے دونوں ایک ساتھ ہی نکلتی تھیں، دیکھتے ہی دیکھتے کالج کے دو سال بھی نکل گئے۔

پچھلے کچھ دنوں سے وہ دونوں محسوس کر رہی تھیں کہ ایک بلیک کورولا روزانہ ان کے تعاقب میں نظر آتی، دونوں ہی پریشان ہوئیں، پھر نغمہ نے ہمت کر کے ایک دن اس گاڑی کو رکوا ہی لیا۔

”اے جناب! میں نے کہا ذرا سنیئے گا۔“ نغمہ نے کاٹ دار لہجے میں کہا۔

”جی! فرمایئے...... زہے نصیب۔“ بلیک کورولا والا شرافت کا مجسمہ بنا ہوا تھا۔

”کیا زہے نصیب......؟“ نغمہ بے حد غصہ میں تھی۔

”یہ آپ نے کیا طریقہ اپنایا ہوا ہے...... پندرہ بیس دن سے دیکھ رہی ہوں، ہر روز آپ ہمارے پیچھے ہی چلے آ رہے ہیں، کوئی اخلاق سیکھے ہیں آپ نے......؟ کیا چاہتے ہیں آپ؟“ غصہ سے نغمہ کی آواز پھٹ رہی تھی۔

تانیہ نے چور نظروں سے اس کی طرف دیکھا، وہ بے فکری سے مسکرا رہا تھا۔

”جی نہیں...... بالکل نہیں...... میں ایسا کچھ نہیں چاہتا...... آپ مجھ پر کیوں بگڑ رہی ہیں؟ ...... میں کچھ نہیں جانتا...... جس طرح آپ ضرورت کے تحت اس سڑک سے جاتی ہیں، میں بھی اسی طرح اس سڑک پر جاتا ہوں۔“ وہ رسانیت سے کہنے لگا۔

”نہیں! آپ اپنے راستے نہیں جاتے...... آپ ہمارا پیچھا کرتے ہوئے کالج تک آتے ہیں، کئی بار میں نے دیکھا ہے۔“ نغمہ کہاں چپ رہنے والی تھی۔

”واہ! یہ آپ کی خوش فہمی ہے...... میں آپ کے پیچھے نہیں بلکہ اپنے بینک کو جاتا ہوں جو اتفاق سے آپ کے کالج کے تھوڑی دور پر ہی ہے، جہاں میں کام کرتا ہوں۔“

یوں اُن لوگوں میں علیک سلیک ہونے لگی...... کالج کی لائبریری میں نوٹس بناتے ہوئے وقت کا اندازہ ہی نہ ہوا...... اور شام کے سایے گہرے ہونے لگے...... جیسے ہی وہ دونوں گیٹ سے باہر نکلیں...... روڈ پر سواریاں یکا دوکا ہی آ جا رہی تھیں...... گھبراہٹ سے دونوں کا بُرا حال تھا...... وہی بلیک کورولا ان کے قریب آ کر رُکی...... دونوں سراسیمہ سی نظر آ رہی تھیں۔

”آج کالج سے واپسی میں بہت دیر ہوگئی آپ لوگوں کو...... چلیے میں ڈراپ کردوں۔“ وہ خوش اخلاقی سے آفر دے رہا تھا۔

”نہیں...... شکریہ، ہم چلی جائیں گی...... آپ فکر نہ کریں۔“

”نغمہ کیا میں آپ کے بھائی کے برابر نہیں ہوں۔“

”آپ میرا نام کیسے جانتے ہیں؟“

”آپ کا نام نغمہ ہے اور یہ آپ کی دوست تانیہ ہے...... آئی ایم رائٹ؟“

”پہلے بتایئے آپ ہمارے نام کیسے جانتے ہیں؟“ دونوں کی بوکھلاہٹ قابل دید تھی۔

”بڑا آسان طریقہ ہے...... آپ لوگوں نے جو ریکارڈ بکس پکڑا ہوا ہے...... اس پر جلی حروف میں آپ کے نام لکھے ہوئے ہیں۔“ وہ شرارت سے مسکراہٹ دبا کر کہنے لگا۔

سب لوگوں کی نظروں سے بچنے کے لیے انھوں نے گاڑی میں بیٹھنا ہی مناسب سمجھا اور گاڑی کا پچھلا دروازہ کھول کر دونوں جلدی سے بیٹھ گئیں۔

”مجھے دانیال احمد کہتے ہیں...... ایم بی اے کر چکا ہوں...... اور بینک میں جنرل منیجر کے پوسٹ پر فائز ہوں۔“ وہ اپنے بارے میں تعارف دے رہا تھا۔

گھر کی نشاندہی کرتے ہی گاڑی کی اسپیڈ کم ہونے لگی...... اور دونوں ہی دروازہ کھول کر جلدی سے شکریہ ادا کیے بغیر گیٹ کے اندر بھاگ گئیں۔

کالج تعطیلات کی وجہ سے بند تھا...... وہ گھر میں ہی تھی...... دیر تک سوتی رہی...... ابھی وہ اٹھنے بھی نہ پائی تھی کہ اس کا چھوٹا بھائی اندر آکر کہنے لگا......

”آپی! آپ کا فون ہے۔“ کوئی صاحب آپ سے بات کرنا چاہتے ہیں۔“ تانیہ کا خون خشک ہوگیا، میز پر پڑا ہوا ریسیور اُٹھایا، اُدھر سے مردانہ آواز میں ہیلو سن کر اس کا دم نکل گیا۔

”تانیہ......“

”جی ہاں!“

”صبح بخیر۔“

”آپ کو یہاں کا فون نمبر کس نے بتایا؟“

”آپ کے گیٹ پر آویزاں ”ملک خان“ کی نیم پلیٹ دیکھ کر ڈائریکٹری سے فون نمبر......“

”آپ کو خدا کا واسطہ یہاں فون نہ کیجیے۔“ تانیہ نے بات کاٹ کر کہا۔

”ایک منٹ فون بند مت کیجیے...... کل دوپہر لنچ کے لیے ہوٹل شیزان میں تشریف لایئے گا......“

دوپہر کو ایک بجے جب ہوٹل پہنچیں تو انتہا سے زیادہ ہونق اور ادھ مری ہو رہی تھیں، وہ دونوں جو کبھی اکیلی باہر نہ نکلی تھیں......

”آیئے! آیئے! خوش آمدید...... السلام علیکم ......“ دانیال مسکراتے ہوئے کہنے لگا۔

دونوں کے منہ سے آواز نہ نکلی...... جان پر کھیل کر نغمہ ہی بولی۔

”آپ نے ہمیں یہاں کیوں بلایا ہے......؟ خدا کے لیے ہمیں جلد جانے کی اجازت دیجیے۔“

”آیئے! تھوڑی دیر ادھر بیٹھتے ہیں۔“ خوشگوار لہجے میں دانیال نے کہا۔

مجبوراً انہیں اس کے ساتھ قدم بڑھانے پڑے۔

”ہاں کہیے! آپ کیا کہہ رہی تھیں......؟“

”میں یہ کہہ رہی تھی کہ ہمارا خاندان قدامت پسند ہے، ہم اپنے رشتے کے بھائیوں سے بھی ملتے جلتے نہیں، اس لیے آپ سے یہی التجا ہے کہ ہمیں ملنے پر مجبور نہ کیجیے گا۔“

دانیال کے چہرے پر لَو دیتی جذبوں کی روشنی ماند پڑ گئی...... مدھم سی آواز میں بولا۔

”ٹھیک ہے، احساس تو مجھے بھی ہوتا ہے...... لیکن دل کی اپنی ضد، اپنی تمنا ہے...... میں نے اپنے اکیلے پن کا مداوا ڈھونڈا تھا...... سمجھا تھا کہ ......“

پھر اس نے اپنا دل کھول کر رکھ دیا۔

”کتنا اکیلا ہوں میں...... اکیلا اور اُداس...... ماں باپ اللہ کو پیارے ہوگئے، بہن کی شادی ہوگئی، وہ اپنے گھر سدھاری...... دوست احباب صرف سکھ کے ساتھی ہیں، دُکھ کے نہیں، کون ہے میرا جو دکھ سکھ میں میرا ساتھ دے سکے......؟ کوئی نہیں ہے۔“ پھر وہ چپ ہوگیا۔

دونوں دم بخود تھیں...... پھر نغمہ نے کہا......

”دانیال صاحب! آپ کا دل سچ مچ بہت تنہا ہیں، آپ تنہا ہیں...... اپنے دکھ سکھ کے خود آپ ساتھی...... مگر بتایئے کہ ہم بزرگوں کی پابند...... گھر کی قید میں...... مجبور لڑکیاں آپ کے لیے کیا کرسکتی ہیں؟ آپ ......آپ......“

”آپ نے اپنا گھر کیوں نہ بسالیا......؟ اس طرح آپ کی تنہائی دور ہوجاتی۔“ نغمہ کی ہمت پر تانیہ نے کہا۔

”ایسی کوئی لڑکی مجھے آج تک ملی ہی نہیں...... جو میری ہم سفر بنتی۔“ دانیال نے تانیہ کے معصوم و بھولے بھالے چہرے کی طرف دیکھ کر کہا۔

”دانیال بھائی! بڑا دُکھ ہوا آپ کی باتیں سن کر......“ نغمہ کا لہجہ رنجیدہ ہوگیا۔

”اب آپ کسی لڑکی کو دوسرے نظریہ سے دیکھیے ...... کہ وہ آپ کے معیار پر پوری اُتر سکے۔“

”ہاں! کوشش کروں گا۔“ وہ معنٰی خیز انداز اور مبہم لہجے میں بولا۔

دونوں نے برائے نام کھانا کھایا، جلد ہی واپسی کے لیے اُٹھ گئیں۔

چلتے چلتے نغمہ گلابوں کے جھنڈ کی طرف لپکی...... جب تک وہ دو تین پھول توڑ کر واپس آتی...... دانیال تانیہ کے قریب آ گیا...... اور مدھم لہجے میں بولا۔

”تانیہ! آپ مجھے اچھی لگتی ہیں...... اسی لیے تو آپ کا ساتھ چاہتا تھا، خدارا! میری تنہائی کی ساتھی بن جایئے۔“

”جی!!“ گھبرا کر اور سہم کر تانیہ نے کہا۔

نغمہ کے آتے ہی بات ختم ہوگئی۔

”کتنے شریف آدمی ہیں...... اللہ ہمیں معاف کرے...... ہم انہیں بدمعاش سمجھ رہے تھے۔“ نغمہ تأسف سے کہہ رہی تھی۔

تانیہ کو کالج جاتے وقت ایسا محسوس ہو رہا تھا...... جیسے اس کی زندگی میں ایک خلاء سا آ گیا ہو۔

”میں آپ کا ساتھ چاہتا ہوں...... میری تنہائی کی ساتھی بن جایئے۔“ بار بار اس کے ذہن میں یہ جملے گونج رہے تھے۔

”نہیں!...... تو، تو کسی اور کی امانت ہے...... کہہ کیوں نہ دیا...... کیا اس مجبور، دُکھی انسان کو آس اور انتظار کی سولی پر لٹکائے رکھے گی...... خدایا! یہ کیا ماجرہ ہے۔“

تانیہ پر ایک بے پناہ دکھ، ایک قاتل صدمہ، دھند کی طرح چھا گیا...... وہ دانیال کا لہجہ بھول نہ سکی، اور اس کے لیے کچھ کر بھی نہ سکی......

اس دن کے بعد سے دانیال کی پرچھائیں بھی ان راستوں پر نظر نہ آئی، ...... تانیہ ان لمحات کو اور اس کے مایوس لہجے کو بھولنے کی کوشش کرنے لگی، اس کے پُرکشش چہرے پر ایک ناتمام آرزو کا دکھ منجمد تھا۔

ایک صبح تعطیل کے دن گھر کے سارے لوگ لاؤنج میں تھے...... تب تانیہ کا چھوٹا بھائی آکر ابا جان سے کہنے لگا......

”کوئی صاحب دانیال احمد آئے ہیں، اور آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔“

”دانیال“ تانیہ دھک سے رہ گئی۔

ابا جان جیسے ہی دیوان خانے میں پہنچے تو دیکھا...... ایک خوبرو نوجوان، بہت مؤدبانہ انداز میں صوفہ پر بیٹھا تھا۔

”فرمایئے صاحبزادے! میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں...... معاف کرنا بیٹے! میں نے آپ کو پہچانا نہیں...... کیا آپ میرے کسی دوست کے بیٹے ہیں؟“

”جی نہیں...... جناب عالی۔“ دانیال نے کہا۔

”آپ مجھے نہیں پہچانتے...... میرا نام دانیال احمد ہے، سینڈیکٹ بینک میں کام کرتا ہوں، آپ کے باغ کے سامنے جو نیلی کوٹھی ہے، وہ میرا غریب خانہ ہے۔“

”اچھا...... اچھا۔“ ابا جان سادگی سے کہنے لگے۔

”میری بے ادبی اور جسارت معاف کیجیے گا حضور! میں ایک درخواست لے کر آپ کے پاس آیا ہوں، میرے والدین عرصہ ہوا گذر چکے ہیں، ورنہ میں آپ کے سامنے عرضِ مدّعا کرنے کی ہمت نہ کرتا۔“

”ہاں...... ہاں...... بے تکلفی سے کہیے۔“

”میری ایک رشتہ دار بہن نے صاحبزادی تانیہ کے لیے نشاندہی کی تھی، میں جناب سے ان کا ہاتھ مانگنے آیا ہوں...... اپنے بارے میں جو کچھ میں نے عرض کیا ہے، سب سچ ہے...... آپ جس سے چاہیں دریافت فرمالیں۔“ دانیال جان پر کھیل کر بولا۔

”تمہیں جھوٹا نہیں سمجھتا بیٹے۔ تم سمجھ دار ہو، تعلیم یافتہ ہو، برسرِ روزگار ہو، خوشی ہوئی تم سے مل کر، مگر بیٹا! میں تمھاری درخواست نامنظور کرنے پر مجبور ہوں، اس لیے کہ میری بیٹی تانیہ، اپنے خالہ زاد بھائی شہریار سے منسوب ہے، پانچ سال پہلے ہی اس کے لندن جانے کی وجہ سے منگنی کردی گئی تھی، آج کل میں ہی وہ آنے والا ہے...... اس کے آتے ہی شادی ہوجائے گی، میں زبان کو بہت اہمیت دیتا ہوں، مجھے افسوس ہے ...... ورنہ تم بہت اچھے بچے ہو، اچھا تو اب خدا حافظ۔“

دانیال کا چہرہ بے رنگ ہوگیا، اس کی آنکھوں میں حسرت، ناکامی اور تمناؤں کے خون کی سرخی چھلک آئی تھی، بہ مشکل اُٹھا اور خود کو سمیٹ کر بولا۔

''معافی چاہتا ہوں، جناب مجھے معلوم نہ تھا کہ ان کی منگنی ہو چکی ہے، ورنہ میں ایسی گستاخی نہ کرتا۔'' اس نے سر جھکا لیا۔

پھر ابا جان کھڑے ہی رہے، اور وہ کمرے سے نکل کر چلا گیا۔

''لیکن کہاں گیا؟'' یہ خیال ایک چور دروازے سے تانیہ کے دل میں آ بیٹھا، وہ بے سدھ کھڑی اس کے مڑ جانے کا منظر اپنی نگاہوں سے کھرچ کر پھینک دینا چاہتی تھی، اس کے بے بس، ناکام و نامراد نظریں کسی طرح بھول نہیں سکتی تھیں۔

وہ اپنے کمرے میں آئی تو رو رہی تھی، اس کے بے چین دل سے صدا اُبھر رہی تھی...

''دانیال! تم پہلے ہی کتنے دُکھی ہو...... تمھاری سرگوشی کے جواب میں ایک تلخ اور ناقابل برداشت حقیقت...... میں نے تم پر واضح کیوں نہ کر دی...... تاکہ تم ناکام محبت کا مزید دُکھ نہ اُٹھاتے۔''

ابا جان کے نزدیک اِن سب باتوں کی کوئی اہمیت ہی نہ تھی، وہ کسی سے کچھ بولے بھی نہیں...... اس واقعہ کو بالکل معمولی سمجھ کر بھول بھی گئے۔

پھر زندگی کا رخ بدل گیا، ایک دن شہریار لندن سے آ گئے...... وہ بہت قابل' مزاج کے نیک اور مخلص آدمی تھے...... خوبصورت' خوب سیرت اور دولت مند آدمی تھے، تانیہ کی تقدیر پر سبھی رشک کر رہے تھے، بہت دھوم دھام سے تانیہ اور شہریار کی شادی ہو گئی، تانیہ' شہریار پہلی اور آخری پسند تھی، وہ بہت محبت کرنے والے آدمی تھے، وہ تانیہ کے ساتھ بہت خوش تھے، شادی کے ہنگامے سرد پڑے تو وہ گھومنے کے لیے نکل گئے، تاج، ایلورا، اجنتا کے غار دیکھنے کے لیے...... ایک شام وہ اجنتا کے غار دیکھ کر واپس آ رہے تھے کہ تانیہ کی طبیعت اچانک خراب ہو گئی۔

وہاں سے شہریار اُسے سیدھے ڈاکٹر کے پاس لے گئے، ڈاکٹر نے تفصیلی چیک اَپ کیا، اور کرسی سے اُٹھتے ہوئے غیر اہم لہجہ میں بولے......

''گھبرانے کی کوئی بات نہیں...... شاید یہ پہلی بار ہے۔''

''جی......! کاہے کی پہلی بار ہے؟'' شہریار نے ہونقوں کی طرح پوچھا۔

''آپ کی مسز ماں بننے والی ہیں۔''

''کیا...... سچ۔'' شہریار کے کہنے پر تانیہ نے دونوں ہاتھوں سے اپنا منہ چھپا لیا۔

پھر ننھے مدثر کے دنیا میں آنکھیں کھولنے تک کتنا خیال رکھا گیا، کتنی محبتیں نچھاور کی گئیں...... ایسی چاہت' ایسا پیار پا کر وہ نہال تھی...... دنیا کی خوش قسمت ترین عورت...... جسے قدرت نے سب کچھ دے رکھا تھا...... عزت' محبت' دولت اور اولاد۔

شہریار اپنے بیٹے کو بے حد چاہتے تھے، ننھے کے سارے کام وہ خود کرتے، راتوں کو بھی خود ہی اُٹھ کر سنبھالتے، تانیہ کو ذرا بھی تکلیف ہونے نہیں دیتے، دن گذرتے جا رہے تھے، اب تانیہ ایک جذباتی اور زود رنج لڑکی نہ تھی، سنجیدہ اور سوبرس خاتون بن گئی تھی، اس نے تقدیر و حالات سے سمجھوتہ کر لیا تھا۔

ننھا مدثر چار سال کا ہو رہا تھا، شام کو اس کی تسمیہ (بسم اللہ) خوانی تھی، تانیہ کا گھر مہمانوں سے بھرا ہوا تھا، نغمہ بھی اپنے دو بچوں کے ساتھ آئی ہوئی تھی، ہنسی مذاق، گانا بجانا، خوشبوئیں، روشنی کی سجاوٹ، کیا نہ تھا وہاں۔

شہریار کو گاڑی کی چابی لے کر باہر جاتے ہوئے دیکھا تو تانیہ نے ٹوک دیا۔

''ارے! یہ کیا؟ آپ کہاں جا رہے ہیں؟ کیا کہیں گے مہمان......؟''

''بس ذرا ریلوے اسٹیشن تک جا رہا ہوں، بہت ہی پرانا دوست آ رہا ہے، ٹرین لیٹ ہونے کی وجہ سے وقت پر نہیں پہنچ سکا، پانچ سال لندن میں میرا روم میٹ رہا ہے۔''

''جلدی آ جایئے گا۔''

''بس یوں گیا اور یوں آیا۔''

تقدیر کا لکھا کون جان سکا ہے...... جیسے وہ پلیٹ فارم پر پہنچے، گاڑی آہستہ آہستہ رُک رہی تھی ﴾ وہ ٹائم پر پہنچنے پر شہریار خدا کا شکر ادا کر رہے تھے کہ ایک زبردست دھماکے کے ساتھ ٹرین کے پرخچے اُڑ گئے...... پلیٹ فارم پر ٹھہرے ہوئے لوگ بھی کھلونوں کی طرح ٹکڑوں میں بٹ گئے، قیامت خیز سماں تھا، پٹریوں پر کسی نے ٹائم بم لگا دیا تھا، جیسے ہی ٹرین ایک جھٹکے سے رُکی...... بم پھٹ پڑا...... اور پورا ریلوے اسٹیشن منٹوں میں ہولناک منظر پیش کر رہا تھا، تھوڑی ہی دیر میں ریڈیو اور ٹی وی سے خبر نشر ہو رہی تھی۔

تانیہ کے گھر میں قیامت کا منظر تھا۔

اس غیر متوقع حادثے نے تانیہ کو پتھرا کے رکھ دیا...... وہ زندہ لاش بن کر رہ گئی۔

''ممی! ڈیڈی کہاں ہیں؟...... ڈیڈی ابھی تک نہیں آئے......؟'

ننھا مدثر اس سے پوچھتا تو صبر مشکل ہو جاتا، قدرت نے اس کے سر پر رنگین آنچل کے بجائے سفید آنچل اُوڑھا دیا...... وہ کچھ سوچ کر تھرّا جاتی، کیا قدرت نے کسی کی نامرادی اور دل شکنی کی سزا دی ہے...... سب

لوگ اس کی دل جوئی میں لگے رہتے...... مگر لا حاصل، جب کبھی ابا جان اُسے صبر کی تلقین کرتے تو وہ رونے لگتی۔

“بیٹی! حدا نے موت ایک اٹل حقیقت بنادی ہے، سب ہی کو ایک دن مرنا ہے، شہریار اتنی ہی زندگی لے کر آئے تھے، تم ساری عمر آنسو بہاؤ گی...... تب بھی کوئی فائدہ نہیں، بیٹی! اللہ نے تمھیں ایک بیٹے کی ماں بنایا ہے، اس کی خاطر زندگی کی طرف پلٹ آؤ، اس کی ماں بنو تانیہ!...... اس کے سہارے جیو...... اس کی تربیت کرو، ایک دن وہ تمھارا سہارا بنے گا۔”

اور لمحہ لمحہ صدیاں بن کر تانیہ کے کچھ سال اور گذر گئے، اب وہ تیس اکتیس سال کی ایک سنجیدہ خاتون تھی، گرمی کی ایک ویران شام تھی...... جب وہ مدثر کے ساتھ باہر لان میں نکل آئی، مدثر اس کا ہاتھ چھوڑ کر باہر کی طرف بھاگا، جیسے ہی وہ گیٹ کے پاس آئی...... چاروں طرف دیکھا، مگر اسے مدثر کہیں نظر نہ آیا، حیران و پریشان باہر نظریں دوڑانے لگی، کچھ ہی دیر بعد وہ ایک شخص کا ہاتھ تھامے سامنے سے آتا ہوا دکھائی دیا...... دفعتاً اس کے قدم زمین میں دھنس گئے۔

“مدثر بیٹا! تم اس گھر میں رہتے ہو؟”

اجنبی کی آواز سن کر وہ سکتے میں آ گئی...... بے شک یہ آواز دانیال احمد ہی کی تھی، آواز سننے کے بعد اس کا رہا سہا شک بھی یقین میں بدل گیا، اُسے محسوس ہوا کہ اُن آنکھوں میں مسرت کی چمک‘ زندگی کی روشنی اور اُمنگوں کی شوخی کچھ بھی تو نہ تھا...... وہ نامرادی جو دس سال پہلے ان کی آنکھوں میں سما گئی تھی...... آج بھی جوں کی توں منجمد تھی۔

دانیال کا ہاتھ کھینچتے ہوئے مدثر جیسے ہی گیٹ کھول کر اندر آیا...... وہ تانیہ کا اُجڑا ہوا حلیہ دیکھ کر حیران رہ گیا۔

“تانیہ آپ......؟” اس کے لب کانپے۔

“دانیال صاحب! کتنی مدت کے بعد دیکھا ہے آپ کو...... کہاں تھے آپ......؟”

“کہاں تھا میں......؟” ایک دُکھ بھری مسکراہٹ اُبھری۔

“ایک دن آپ سے جدا ہو گیا تھا...... ایک دن آپ سے مل گیا ہوں، درمیانی لمحے کہاں گئے یہ میں نہیں بتا سکتا......”

“انکل اندر آیئے ناں...... یہ میری امی ہیں۔” مدثر بڑی خوشی سے بتا رہا تھا۔

اس کا اجڑا روپ دیکھ کر دانیال کا دل دہل گیا، اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ بات کو کہاں سے شروع کرے۔

“کب ہوا یہ حادثہ......؟”

“پانچ سال ہو گئے۔”

“میری سمجھ میں نہیں آ رہا ہے کہ کن الفاظ میں صبر کی تلقین کروں۔”

“صبر کر لیا ہے میں نے۔”

“اب آپ کیا اپنے والدین کے پاس رہتی ہیں......؟”

“جی ہاں!”

“بالکل خاموشی...... کیا اس وقت گھر میں کوئی نہیں......؟”

“ہاں! سب لوگ شادی میں گئے ہیں۔”

“اور آپ؟”

“میں نے تقاریب میں جانا چھوڑ دیا ہے۔”

“اچھا میں چلتا ہوں، مجھے یہاں آئے ہفتہ دس دن ہی ہوئے ہیں، مدثر کو اکثر میں یہاں بلا کر اس سے باتیں کیا کرتا تھا، مجھے معلوم نہ تھا کہ یہ آپ کا بیٹا ہے، خیر میں اب چلوں گا، کبھی آیئے گا آپ......”

دو دن بعد مدثر ضد کر کے تانیہ کو دانیال کے بنگلے پر لے گیا، باہر سے خوبصورت نظر آنے والا بنگلہ اندر سے اُتنا ہی ویران اور بے رونق تھا، یہاں ایک ملازم کے سوا کوئی نہ تھا، تانیہ اب خوفزدہ یا سراسیمہ نہ تھی...... تیس سال کی ایک بیوہ عورت کو ایک سن رسیدہ مرد سے کیا خوف ہو سکتا ہے، دانیال گھر پر ہی تھے، وہ سامنے پڑی ہوئی کرسیوں پر بیٹھ گئے۔

“کہہ نہیں سکتا کہ ایک عرصہ کے بعد آپ کو دیکھ کر کس قدر حیران ہوں، یہ آپ کا حلیہ‘ سفید لباس‘ آپ کی سونی کلائیاں‘ چہرے پر اُداسی‘ مجھ سے برداشت نہیں ہو رہی ہے۔”

“خیر!! آپ بتایئے...... کہاں رہے اتنے دن؟...... آپ کی بیوی بچے‘ وہ سب کہاں ہیں......؟”

“آپ سے جب آخری بار جدا ہوا...... میرے لیے زندگی میں اور اس دنیا میں کچھ نہیں رہ گیا تھا، ان ہی دنوں میری بہن امریکہ سے اچانک آ گئیں...... شادی کے لیے ان کا اصرار اور میرا انکار...... پھر وہ مجھے امریکہ لے گئیں، کئی سال رہا وہاں...... بہن اور بہنوئی شرعی اعتبار سے مجھ پر دباؤ ڈالنے لگے، تو جان چھڑانا مشکل ہو گیا تھا، مجبوراً بھاگ کر یہاں ہی آنا پڑا، میں آپ کے والد سے ملنے کا سوچ ہی رہا تھا کہ مدثر سے ملاقات ہو گئی۔”

تانیہ کے پاس کہنے کو کیا تھا، وہ مدثر کا ہاتھ پکڑے واپس آ گئی، چند دن بعد ڈرائنگ روم سے آنے والی باتوں کی آواز نے تانیہ کو چونکا دیا، ابا جان اور دانیال کی باتوں کی آواز آ رہی تھی، بہت دیر بعد دانیال کو بھیج کر ابا جان واپس اندر آئے، وہ اس وقت عشاء کی نماز سے فارغ ہو کر جائے نماز

تہہ کر رہی تھی۔

''تانیہ بیٹا......! اگر تم فرصت میں ہو تو کچھ بات کرلوں۔''

''ہاں! ہاں......ابا جان! ضرور، آیئے، بیٹھیے۔''

''بیٹی! ابھی جو صاحب مجھ سے بات کر رہے تھے......دانیال احمد، تمھاری شادی سے کچھ دن پہلے مجھ سے ملنے آئے تھے، مجھ سے تمھارا ہاتھ مانگنے، اس دن میں اس لڑکے کی باتوں سے بہت متاثر ہوا تھا، اور آج تو اس نے میرے دل میں اپنا گھر بنالیا ہے، گزرے دس سال وہ اپنی بہن کے ساتھ امریکہ میں رہا ہے، اب اسی نے یہاں سیٹل ہونے کے لیے پلان کرلیا ہے، مدثر کے ذریعہ اُسے تمھارے حالات کا علم ہوا تو وہ مجھ سے ملنے کے لیے آیا تھا، دس سال کا عرصہ اس نے تمھاری یاد کے سہارے گزار دیے ہیں، اور اب ایک بار پھر وہ تمھارا طلب گار ہے۔'' ابا جان اُسے گہری نظروں سے دیکھ رہے تھے۔

''مگر ابا جان! اب یہ کیوں کر ممکن ہے...... میں مناسب نہیں سمجھتی۔'' تانیہ کی نظریں نیچے جھکی ہوئی تھیں۔

''دانیال نے تو دل کھول کر میرے سامنے رکھ دیا......وفا کی مثال قائم کی، اپنا اور اپنے بچے کا مستقبل سوچو۔''

''ابا جان! میری سمجھ میں کچھ نہیں آتا۔'' اس نے سر تھام لیا۔

وہ اُن سے دوبارہ نہیں ملی تھی......مگر ابا جان اُس کی سوچ کے در وَا کر چکے تھے۔

ایک شام مدثر اسکول سے آکر دانیال کے گھر گیا، اور جلد ہی واپس آکر بولا۔

''امّی چلیے......جلدی چلیے۔''

''کہاں......؟''

''امی! دانیال انکل کو بہت بخار ہے...... جب میں ان کے پاس گیا تو وہ سر درد سے کراہ رہے تھے، اُن کے پاس کوئی نہیں ہے۔''

''اچھا چلتی ہوں۔'' تانیہ اُٹھی اور اس کے ساتھ چلی گئی۔

وہ انھیں دیکھتی رہ گئی، بخار کی تمازت سے چہرہ تمتما رہا تھا۔

''کیسی طبیعت ہے؟ کب سے آرہا ہے بخار؟''

''تمھیں زحمت دی مدثر نے...... میں ٹھیک ہوں...... پریشانی کی کوئی بات نہیں۔''

''میں آپ کے لیے کچھ بنا کر لاتی ہوں، ساتھ میں کوئی دوا بھی لاآؤں گی۔''

''نہیں! تم کچھ نہ کرو، بس میرے پاس بیٹھی رہو۔ تمہیں دیکھتا رہوں گا...... اور ٹھیک ہو جاؤں گا تانیہ...... اب میں صبر اور برداشت کی طاقت نہیں رکھتا، معاف کردو مجھے کہ میں تمھاری اور اپنی حیثیت بھول چکا ہوں، تانیہ! جب سے تمھیں سفید لباس میں دیکھا ہے...... دوسرا لباس پہنو...... پژمردہ ہونٹوں پر مسکراہٹ آنے دو......تم جو فیصلہ کروگی میں اسی کو مان لوں گا، میں صرف تمھیں خوش دیکھنا چاہتا ہوں......مگر اب میں ڈرنے لگا ہوں، خود سے، تقدیر سے...... اور...... اور تم سے بھی...... کہیں تم خفا نہ ہو جاؤ۔ کاش! میں نے اپنے دل پر قابو رکھا ہوتا......آج تک جو کچھ تم سے نہیں کہا تھا اب بھی نہ کہتا...... مگر تانیہ! اب میں بکھر گیا ہوں، ہمت پست ہوگئی ہے، حوصلہ ہار گیا ہوں، معاف کردو مجھے، خفا نہ ہونا مجھ سے، تانیہ!! آج تم اتنے قریب آگئیں...... میں ضبط نہ کرسکا، کیا ہوگیا ہے مجھے...... میں یہ سب تم سے کیوں کہہ رہا ہوں؟ تانیہ! تمھاری خاطر...... صرف تمھاری خاطر ناکامیوں اور نامرادیوں کو سینے سے لگائے جیتا رہا......صرف ایک امید پر......ایک آس پر کہ تم ہمیشہ خوش و خرم رہو......اپنی زندگی میں......اپنے گھر میں، اپنے جیون ساتھی کے ساتھ...... ہمیشہ کامیابی تمھارے قدم چومے، لیکن آج......قسمت تمھیں میرے پاس لے آئی ہے، تو میں خاموش نہیں رہ سکا......اب میں ناکامیوں سے سمجھوتہ نہیں کرسکتا، میں ہار جاؤں گا۔ تانیہ! مجھے مرنے نہ دینا......تم اور مدثر مجھ سے دور ہوگئے تو میں جی نہ سکوں گا، مجھے بچالو تانیہ۔'' اور تب اچانک وہ بے قابو ہوگیا۔

تانیہ کے حلق میں آنسوؤں کے پھندے پڑ گئے......وہ دس سال کا لمبا عرصہ پھلانگ کر پھر اپنے ناسمجھ دور میں پہنچ گئی تھی...... وہ سب کچھ بھول گئی، پھر تانیہ کو اپنے دل کا کہا ماننا پڑا۔

یہ دنیا والے...... یہ ستم گر تقدیریں...... یہ تو تکلیفیں دیتی ہیں...... کچوکے لگاتی رہتی ہیں......کیا خود اپنے جذبات اور اپنے محسوسات کچھ بھی نہیں......؟ جینے کے لیے بھی بہانے چاہیے۔

تانیہ نے دانیال کے آنسو اپنے آنچل میں سمیٹ لیے......اور ان کا ہاتھ اپنے کانپتے ہوئے ہاتھوں میں لے کر اُن پر اپنی بھیگی آنکھیں رکھ دیں۔

□□□

Khairunnisa Aleem
H.No: 16-2-141/B
Flat No: 301
Near Officers Mess Malakpet
Hyderabad-500036 (T.S.)

احساس

فوزیہ حبیب

شیرین کا تعلق ایک غریب خاندان سے تھا وہ دس سال کی تھی جب اس کے والد چل بسے کچھ عرصے بعد اس کی ماں کا بھی انتقال ہوگیا۔ وہ اس وقت بارہ سال کی تھی اور اس کا چھوٹا بھائی دانش تین سال کا تھا۔ نانی نے انھیں پالا مگر غربت کی وجہ سے وہ انھیں پڑھا نہ سکتی تھیں نانی کو کپڑے سینے کا شوق تھا۔ کسی نہ کسی طرح انھوں نے ایک سیکنڈ ہینڈ سلائی مشین خریدی۔ وہ شیرین کو بھی سلائی کرنا سکھا رہی تھیں کچھ ہی دنوں میں شیرین نے بھی سلائی کرنا شروع کردیا۔ وہ اٹھارہ سال کی ہوئی تو نانی کو اس کی شادی کی فکر لگ گئی۔ مگر اس کی شادی کا ارمان لیے نانی بھی اس دنیا سے رخصت ہوگئیں۔

وقت نے شیرین کو اپنی عمر سے زیادہ سمجھدار بنا دیا تھا۔ دانش ایک معمولی سے سرکاری اسکول میں پڑھتا تھا وہ پڑھائی میں بہت تیز تھا۔ شیرین کی اب ایک ہی خواہش تھی کہ اس کا بھائی دانش پڑھ لکھ کر بڑا آدمی بن جائے اس کے لیے وہ دن رات محنت کرتی وہ کشیدہ کاری بھی جانتی تھی۔ محلے کی عورتوں نے اس کو بڑے گھروں کے کام بھی دلوائے تھے امیر گھروں کی لڑکیاں ہاتھ کی بنی ہوئی کشیدہ کاری کے سوٹ پہننے کی شوقین تھیں۔ شیرین کے محلے میں سب اسی کی طرح ہی غریب تھے لیکن دکھ سکھ کے ساتھی تھے۔ انھیں میں ایک ساجدہ خالہ بھی تھیں جو ایک بڑی سی کوٹھی میں کام کرتی تھیں۔ انھوں نے ہی شیرین کو سلائی کا کام بھی دلوایا تھا ساجدہ خالہ بیوہ تھیں اور ان کی اولاد نہیں تھی۔ وہ شیرین اور دانش کو اپنی اولاد کی طرح چاہتی تھیں۔ ان کی خواہش تھی کہ شیرین شادی کرلے وہ جس گھر میں کام کرتی تھیں ان کا ڈرائیور بہت اچھا لڑکا تھا۔ ساجدہ خالہ چاہتی تھیں کہ اس سے شیرین کی شادی ہوجائے لیکن شیرین نے صاف انکار کردیا۔ اس کی زندگی کا مقصد صرف اور صرف دانش کا مستقبل سنوارنا تھا۔

دانش نے میٹرک میں پورے صوبے میں ٹاپ کیا تھا اور اس کی تصویر اخبار میں بھی چھپی تھی شیرین کی آنکھوں سے خوشی کے آنسو جاری ہوگئے۔ دانش میڈیکل میں جانا چاہتا تھا اور اس کے لیے اس نے ابھی سے تیاری شروع کردی تھی اس کے خوابوں کو پورا کرنے کے لیے شیرین نے جی جان لگا دی تھی۔ دانش کو اسکالرشپ ملی تھی اس سے شیرین کو بہت حوصلہ ملا۔ دانش نے بھی شام کے وقت بچوں کو ٹیوشن پڑھانا شروع کردیا اسی طرح ان کی زندگی کی گاڑی چلتی رہی۔ دانش کے میڈیکل میں ایڈمیشن کے وقت شیرین کو بہت مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ آخر شیرین کی انتھک محنت اور دانش کے اسکالرشپ کی وجہ سے اس کا میڈیکل میں ایڈمیشن ہوگیا۔ یہ پانچ سال کس طرح گزرے اللہ ہی بہتر جانتا تھا جس دن دانش کے ہاتھ میں میڈیکل کی ڈگری آئی وہ سجدۂ شکر بجالایا۔ دانش کو اب یہ گھر اور محلّہ برا لگنے لگا وہ کہتا

’’آپا اب ہم یہاں نہیں رہیں گے میں جلد ہی دوسرا گھر لے لوں گا پھر ہم یہاں سے شفٹ ہوجائیں گے‘‘۔

لیکن اس کی نوبت ہی نہیں آئی۔ دانش جس ہسپتال میں جاب کرتا تھا وہاں کے باس کی بیٹی سے اس کو پیار ہوگیا اور وہ اس سے شادی کرنا چاہتا تھا وہ شیرین سے پوچھ نہیں رہا تھا بلکہ اطلاع دے رہا تھا لیکن لڑکی نے شرط رکھی تھی کہ وہ اس کے ساتھ امریکہ میں جا کر رہے گا۔ دانش کی خواہش کے مطابق اس کی شادی ہوگئی شیرین نے مہمانوں کی طرح شرکت کی کسی نے بھی کسی بھی معاملے میں اس کی رائے لینا مناسب نہیں سمجھا۔ شادی کے بعد دانش امریکہ سیٹل ہوگیا۔ اس نے شیرین سے کہا تھا کہ وہ ہر مہینے پیسے بھجوادے گا۔ شیرین اب بالکل تنہا ہوگئی تھی اس کی تنہائی کے خیال سے ساجدہ خالہ اس کے پاس آگئی تھیں ویسے بھی اب وہ بہت بوڑھی ہوگئی تھیں ان سے کوئی بھی کام نہیں ہوتا تھا۔ شیرین سارا دن ساجدہ خالہ کی خدمت کرتے ہوئے گزار دیتی اسی طرح کئی سال گزر گئے۔

اس دوران دانش صرف ایک بار آیا تھا اور ان دونوں کو ایک نئے

گھر میں شفٹ کر کے چلا گیا تھا۔ دانش کے دو بچے تھے ایک بیٹا اور ایک بیٹی شیرین نے انھیں صرف تصویروں میں دیکھا تھا دانش کی بیوی اور بچے ایک بار بھی نہیں آئے تھے۔ ساجدہ خالہ کو یہ خیال غمگین رکھتا تھا کہ ان کے بعد شیرین کا کیا ہوگا وہ شیرین سے کہتی تھیں کہ اب بھی وقت ہے وہ شادی کر لے۔ شیرین ہنس کر کہتی کہ اب اس کی عمر شادی کی نہیں ہے اس کے بالوں میں چاندی اتر آئے تھے۔ وہ دانش کی طرف سے مایوس ہو چکی تھی کہ وہ اب کبھی نہیں آئے گا ۔

لیکن اس دن شیرین کی خوشی کی انتہا نہ رہی جب دانش کا فون آیا کہ وہ اپنے بیوی بچوں کے ساتھ آ رہا ہے اس کے سسر کا انتقال ہو گیا تھا اور وہ لوگ شام کی فلائٹ سے آ رہے تھے۔ وہ بے انتہا خوش تھی اور اس کی خوشی دیکھ کر ساجدہ خالہ کے دل سے دعائیں نکل رہی تھیں کہ یہ خوشی برقرار رہے دانش یہاں آنے کے پورے چار دن بعد شیرین سے ملنے آیا لیکن اچھی بات یہ تھی کہ اس بار اس کی بیوی اور بچے بھی اس کے ساتھ تھے۔ دانش کی بیٹی سمائرہ دس سال کی تھی اور بیٹا عمر آٹھ سال کا ۔ وہ دونوں کو گلے سے لگا کر رو پڑی۔ کچھ ہی دیر بعد وہ لوگ جانے کے لیے کھڑے ہو گئے شیرین نے انھیں روکنے کی کوشش کی لیکن وہ لوگ نہیں مانے۔ سمائرہ نے ضد پکڑ لی کہ وہ آج پھپھو کے پاس رہے گی مجبوراً ان دونوں کو اسے یہیں چھوڑ کر جانا پڑا شیرین کا بس نہ چلتا تھا کہ وہ سمائرہ کو اپنے کلیجے میں چھپا کر ہمیشہ کے لیے یہیں رکھ لے وہ ہو بہو شیرین جیسی تھی۔

دانش نے کہا تھا کہ وہ کل آ کر سمائرہ کو لے جائے گا مگر اسے ضروری کام تھا اسی لیے اس نے پرسوں آنے کا کہہ دیا شیرین نے اس کے ساتھ بہت اچھا وقت گزارا اس کی برسوں کی تشنگی سمائرہ کو دیکھ کر جاتی رہی۔ دو دن بعد دانش سمائرہ کو لینے آیا تو اس کے ساتھ عمر بھی تھا ۔ شیرین نے دانش سے کہا کہ اب وہ یہیں آ کر سٹیل ہو جائے وہ اب ان سب کے بغیر نہیں رہ سکتی اس کے جواب میں دانش نے بیزارگی سے جواب دیا

'' آپا بیکار کی باتیں نہ کریں۔ ہم لوگ یہاں نہیں رہ سکتے آپ یہاں ساجدہ خالہ کے ساتھ خوش رہیں میں آپ کو پیسے بھجواتا رہوں گا ''

اس کی تلخ باتیں سن کر وہ خاموش ہو گئی ۔

'' چلو سیم چلتے ہیں'' وہ سمائرہ کو آواز دینے لگا شیرین نے سمائرہ اور عمر کو تحفے دیے تھے لیکن عمر کو سمائرہ کا تحفہ پسند آ گیا اور وہ ضد کرنے لگا کہ وہ سمائرہ کی چیز ہی لے گا مگر سمائرہ مان نہیں رہی تھی دانش نے اسے سمجھایا مگر وہ وہاں سے بھاگ نکلی اس کے پیچھے پیچھے عمر بھی بھاگا اور سامنے پڑے ہوئے ٹیبل سے ٹکرا کر گر گیا اس کی پیشانی سے خون نکل رہا تھا اور وہ زور زور سے رو رہا تھا۔ سمائرہ کونے میں کھڑی چپ چاپ تماشہ دیکھ رہی تھی دانش کو غصہ آ گیا اس نے سمائرہ کو ڈانٹتے ہوئے کہا کہ '' اگر وہ اپنی چیز عمر کو دے دیتی تو کیا ہو جاتا اور کیا تم کو عمر کی رونے کی پرواہ بھی نہیں ہے ''

'' نہیں'' سمائرہ نے پٹ سے جواب دیا '' مجھے عمر کی کوئی پرواہ نہیں ہے''

دانش نے کہا '' پرواہ کیوں نہیں ہے آخر عمر تمھارا بھائی ہے''

'' آپ بھی تو پھپھو کے بھائی ہیں پھپھو نے آپ کو پالا آپ کو پڑھایا لکھایا لیکن آپ نے پھپھو کو اکیلا چھوڑ دیا بڑے ہونے کے بعد عمر بھی مجھے چھوڑ دے گا''

سمائرہ کا جواب سن کر دانش پر سکتہ سا طاری ہو گیا وہ کچھ کہنے کے قابل نہ رہا

'' سیم تم یہ سب کیسے جانتی ہو'' شیرین نے حیرانگی سے پوچھا۔

'' مجھے ساجدہ دادی نے سب بتا دیا ہے'' شیرین نے ناراضگی سے ساجدہ خالہ کو دیکھا اور سمائرہ کو سمجھانے لگی۔

'' بیٹا بری بات ہے پاپا سے اس طرح بات نہیں کرتے معافی مانگو ان سے''

دانش نے کہا '' معافی تو مجھے آپ سے مانگنی چاہیے آپا ! سمائرہ نے میری آنکھیں کھول دی ہیں میں آپ سے معافی مانگنے کے قابل بھی نہیں ہوں ہو سکے تو مجھے معاف کر دیں۔''

دانش نے ہاتھ جوڑ کر شیرین سے کہا شیرین نے روتے ہوئے دانش کو گلے لگا لیا دانش نے کہا کہ آج مجھے احساس ہو گیا ہے کہ خون کے رشتے میں بڑی کشش ہوتی ہے سمائرہ نے اتنے سال دور رہنے کے باوجود آپ کے دکھ کو محسوس کر لیا اب میں آپ کو چھوڑ کر کبھی نہیں جاؤں گا''

یہ کہہ کر اس نے شیرین اور دونوں بچوں کو گلے لگا لیا۔ شیرین نے خدا کا شکر ادا کیا کہ اللہ نے اس کے صبر کو رائیگاں نہیں جانے دیا اور اس کی بھتیجی کے ذریعے اس کے بھائی کے دل میں احساس جگایا بیشک اللہ پاک صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔

□□□

Fouzia Habeeb
Assistant Professor
Department of Urdu
Islamiah Women's Arts&Science College,
Vaniyambadi-635751 (Tamil Nadu)

نیلوفر پروین

باباجانی

مغرب کی نماز پڑھ کے نسیم صاحب اور خالد صاحب مسجد سے نکلے اور گھر کی طرف چل دیے۔ دونوں پرانے دوست اور رشتے دار تھے۔ خالد صاحب ایک کالج کے پرنسپل تھے۔ نسیم صاحب کا شہر کے کمرشیل ایریا میں کپڑوں کا بڑا سا شوروم تھا جہاں ہر برانڈ کے کپڑے دستیاب تھے۔ ان کی بیگم شبانہ خالد صاحب کی سگی خالہ زاد بہن تھیں۔

روزانہ شام کی چائے دونوں ساتھ پیتے اور حالاتِ حاضرہ کی باتیں کرتے گویا وہ نسیم صاحب کی تنہائی کے ساتھی تھے۔ عشاء کی نماز پڑھنے کے بعد ہی وہ گھر واپس جاتے تھے۔

نسیم صاحب دن بھر دکان میں بیٹھتے اور مغرب سے پہلے واپس گھر آجاتے تھے۔

ایم بی اے کرنے کے بعد ارحم نے اپنے بابا جانی کے کاروبار کو بہت اچھی طرح سے سنبھال لیا تھا۔ پرانے وفادار ملازم بھی کاؤنٹر پہ موجود رہتے تھے۔ اللہ کے فضل وکرم سے دکان کی آمدنی کافی اچھی خاصی تھی۔ اسٹاف کی تنخواہ معقول تھی۔ نسیم صاحب وقت ضرورت ان لوگوں کی ہر طرح سے امداد بھی کیا کرتے تھے۔ یہی تربیت ارحم کی بھی ہوئی تھی۔ غرور وتکبر سے دور تھے۔ سبھوں سے اخلاق ومحبت سے پیش آتے جس کی وجہ سے سب لوگ بہت خوش رہتے تھے۔

نسیم صاحب کے والد عظیم احمد صاحب اپنے آبائی گھر خیرآباد میں پشتینی زمین جائداد کے مالک تھے۔ لکھنؤ شہر کے پوش علاقے میں بھی انھوں نے اپنا ایک خوبصورت اور کشادہ مکان بنوایا تھا اور اپنے دونوں بچوں کی تعلیم وتربیت بھی بہت اچھی کی تھی، ان کی بڑی بیٹی شہناز اور ان سے چھوٹے نسیم صاحب تھے۔

دونوں کی شادی کے فرائض سے سبکدوش ہوکر مع اپنی بیگم کے فریضۂ حج بھی ادا کرلیا تھا۔ صوم وصلوٰۃ کے پابند نیک شریف انسان تھے

پھر دو سال بعد پوتا ارحم کی آمد سے ان کے گھر کی خوشیاں دوبالا ہوگئیں مگر عظیم صاحب اس سے زیادہ فیضیاب نہ ہوسکے۔

ایک رات سوئے تو صبح اُٹھ نہ سکے۔ کوئی بیماری بھی نہیں تھی۔ بس ان کا بلاوا آچکا تھا، جنت سدھار گئے۔۔۔ اس طرح اچانک ان کے گزر جانے سے اماں بی سکتے میں آگئیں پہلے ہی سے وہ شوگر اور بلڈ پریشر کی مریضہ تھیں۔

اس دکھ نے ان کی زندگی ویران کردی۔ عدت کے بعد بھی ان کا زیادہ وقت اپنے کمرے میں عبادت میں گزرتا تھا۔

شومئی قسمت کہ نسیم صاحب کی بہن شہناز باجی شادی کے برسوں بعد بھی جب ماں نہ بن سکیں تو معائنہ اور رپورٹ سے پتہ چلا کہ وہ ماں بننے کے شرف سے ہی محروم ہیں۔ شوہر اور ساس، سسر کو ان کی یہ محرومی گوارا نہ ہوئی۔ وہ لوگ بیٹے کی دوسری شادی کرنا چاہتے تھے لیکن شہناز باجی سوتن کے ساتھ رہنے کو تیار نہ تھیں۔ لہٰذا سزا کے طور پر ہمیشہ کے لیے میکے بھیج دی گئیں۔

اماں بی اور بھائی، بھاوج نے اللہ کی رضا سمجھ کر صبر کرلیا تھا۔ شہناز باجی کا میکہ ہی اب پناہ گاہ تھا، جہاں اماں بی، نسیم صاحب اور شبانہ بیگم کی بے پناہ محبتوں اور ارحم کی کلکاریوں میں انھوں نے اپنے دکھ کو بھلانے کی کوشش کی تھی مگر کبھی کبھی اپنے مزاج کی چڑچڑاہٹ سے انھیں شرمندگی بھی ہونے لگتی تھی۔

وقت کا پنچھی محو پرواز تھا۔ نسیم صاحب کاروبار میں ارحم کی کارکردگی اور دلچسپی سے مطمئن اور خوش تھے وہ فرنیچرز کے کاروبار کے لیے بھی نیا شو روم کھولنے کی تیاری کررہے تھے تو شبانہ بیگم بھی اب بیٹے کے سر سہرا سجانے اور ایک پیاری سی بہو گھر لانے کے لیے کوشاں تھیں۔ وہ اپنے اکلوتے بیٹے کی شادی بڑی دھوم دھام سے کرنا چاہتی تھیں۔ اللہ کا دیا گھر میں بہت کچھ تھا، اب بہو لانے کی جلدی تھی۔

مگر ستم ظریفی کہ ان کی یہ آرزو ادھوری رہ گئی، ایک شام کسی عزیز کی عیادت کرنے ہسپتال گئیں۔ واپسی پر ون وے تھا۔ ڈرائیور نے گاڑی سڑک کے دوسری طرف لگایا ہوا تھا۔ وہ روڈ کراس کررہی تھیں کہ ایک تیز رفتار موٹر سائیکل نے زوردار ٹکر ماردی۔ وہ اُچھل کر گر پڑیں۔ حادثہ جان لیوا تھا۔

گھر ایک بار پھر ماتم کدہ بن گیا۔ ہر طرف ویرانی چھا گئی۔ شبانہ بیگم نیک اور خلیق خاتون تھیں۔ ان کی محبتوں کے خاندان میں سب ہی گرویدہ تھے۔ اپنی ساس اور بڑی نند کا بھی انھوں نے ہمیشہ بہت عزت واحترام کیا تھا۔ ان کے اس طرح چلے جانے سے سب بہت دکھی تھے۔ دل تو سب کا رو رہا تھا مگر نسیم صاحب کو اپنی زندگی درگور لگ رہی تھی۔ وہ بالکل ٹوٹ چکے تھے۔ خالد صاحب اور ان کے گھر والے سب کی دیکھ بھال کر رہے تھے۔ ارحم بھی اس شدید دکھ سے نڈھال تھے۔ محبت کرنے والی ماں کو منوں مٹی تلے سُلا آئے تھے مگر یقین نہیں آرہا تھا انھیں لگتا امی جان انھیں آواز دیتی ابھی کسی کمرے سے نکل کر سامنے آجائیں گی مگر دوسرے ہی پل ان کا کفن میں لپٹا چہرہ سامنے آجاتا۔ وہ اپنے آنسوؤں کو بڑی مشکل سے روک لیتے کہ انھیں اپنے بابا جانی کو بھی سنبھالنا تھا۔ دونوں ہی ان کی کمی شدت سے محسوس کررہے تھے۔ تاہم جانے والے کے ساتھ زندگی ختم نہیں ہوتی۔ رفتہ رفتہ سب اپنے کاموں میں مصروف ہوگئے، مگر گھر کا سارا نظام بکھر گیا تھا۔

شبانہ بیگم کے گزرجانے کے بعد اماں بی کی دیکھ بھال کے ساتھ گھر کی دیگر ذمہ داریوں سے شہناز باجی پریشان رہتی تھیں۔ انھیں بھلا ان سب کی عادت کہاں تھی؟ بھاوج کے رہتے آرام ہی کیا تھا۔ ملازمہ ہی کھانا بناتی، دوسری گھر اور کچن کی صفائی کرتی، ایک ملازم باہر کا سارا کام پہلے ہی کی طرح انجام دیتا تھا پھر بھی باجی کا پارہ چڑھا رہتا۔ ان کا مزاج ہی نرالا تھا۔ بات بات پر ملازموں کو ڈانٹ ڈپٹ کرتی تھیں، سارا نظام درہم برہم تھا۔ کبھی گھر میں ضروریات کا سامان ختم ہوجاتا، کبھی اماں بی کی دوائیاں، ملازموں کو وقت پر تنخواہ دینا اور سامان منگوانے کا کام بھی اب نسیم صاحب کو کرنا پڑرہا تھا۔ اماں بی بیمار تھیں خاموشی سے سب کچھ برداشت کرتی اور بہو کو یاد کرتیں۔

شبانہ بیگم بہت سگھڑ اور سمجھدار تھیں۔ امور خانہ داری کے ساتھ گھر کی بہت ساری ذمہ داریاں خوش اسلوبی کے ساتھ سنبھال رہی تھیں۔ کھانا خود بناتیں۔ اماں بی کے لیے پرہیزی کھانے کے علاوہ سب کی پسند اور

ذائقہ کا پورا خیال رکھتیں۔ دعوت میں مہمانوں کے لیے اہتمام کے ساتھ خاندان میں لین دین کی ساری ذمہ داریاں وہ خود دیکھتی تھیں۔ نسیم صاحب ان سارے معاملات سے بےفکر رہتے تھے۔

شبانہ بیگم کے گزر جانے کے بعد اماں بی کی دیکھ بھال کے ساتھ گھر کی دیگر ذمہ داریوں سے شہناز باجی پریشان رہتی تھیں۔ انھیں بھلا ان سب کی عادت کہاں تھی؟ بھاوج کے رہتے آرام ہی کیا تھا۔ ملازمہ ہی کھانا بناتی، دوسری گھر اور کچن کی صفائی کرتی، ایک ملازم باہر کا سارا کام پہلے ہی کی طرح انجام دیتا تھا پھر بھی باجی کا پارہ چڑھا رہتا۔ ان کا مزاج ہی نرالا تھا۔ بات بات پر ملازموں کو ڈانٹ ڈپٹ کرتی تھیں، سارا نظام درہم برہم تھا۔ کبھی گھر میں ضروریات کا سامان ختم ہوجاتا، کبھی اماں بی کی دوائیاں، ملازموں کو وقت پر تنخواہ دینا اور سامان منگوانے کا کام بھی اب نسیم صاحب کو کرنا پڑ رہا تھا۔ اماں بی بیمار تھیں خاموشی سے سب کچھ برداشت کرتی اور بہو کو یاد کرتیں۔

یار نسیم اب ارحم کی شادی کا سوچو تاکہ گھر کے حالات میں تبدیلی اور رونق آسکے۔
ہم۔۔ میں بھی کچھ دنوں سے سوچ رہا ہوں، خود ذہنی طور پر بہت تھک گیا ہوں یار۔
تمھاری نظر میں کوئی اچھا رشتہ ہو تو بتانا بلکہ ثمینہ بھابی سے بھی کہنا۔ عورتوں کو ان باتوں کی زیادہ خبر ہوتی ہے۔ مجھے بس اچھی فیملی کی سمجھدار لڑکی چاھئیے۔ اللہ کا دیا تو سب کچھ ہمارے پاس ہے۔ نسیم صاحب نے کہا۔
اچھا ثمینہ کے ذکر سے مجھے یاد آیا۔۔۔۔
ایک ماہ پہلے ثمینہ بیگم نے بھی مجھے اپنی چچازاد بہن سائقہ کی نند کے لئے رشتے کی بات بتارہی تھی۔ چار نندوں میں سب سے بڑی نند ”افسانہ“ ہے، پڑھی لکھی سگھڑ لڑکی ہے۔

نسیم صاحب ماں کو دلاسہ دیتے۔ شہناز باجی سے کچھ بھی کہنا، سمجھانا بےکار تھا۔ وہ اپنی قسمت کا رونا رونے لگتیں سو وہ اپنی ساری پریشانیاں اپنے عزیز دوست خالد صاحب سے ہی شیئر کرتے تھے۔

شبانہ بیگم کو گزرے ایک سال ہوگیا تھا ایک شام باتوں باتوں میں خالد صاحب نے کہا۔۔

یار نسیم اب ارحم کی شادی کا سوچو تاکہ گھر کے حالات میں تبدیلی اور رونق آسکے۔

ہم۔۔ میں بھی کچھ دنوں سے سوچ رہا ہوں، خود ذہنی طور پر بہت تھک گیا ہوں یار۔

تمھاری نظر میں کوئی اچھا رشتہ ہو تو بتانا بلکہ ثمینہ بھابی سے بھی کہنا۔ عورتوں کو ان باتوں کی زیادہ خبر ہوتی ہے۔ مجھے بس اچھی فیملی کی سمجھدار لڑکی چاہیے۔ اللہ کا دیا تو سب کچھ ہمارے پاس ہے۔ نسیم صاحب نے کہا۔

اچھا ثمینہ کے ذکر سے مجھے یاد آیا۔۔۔۔۔

ایک ماہ پہلے ثمینہ بیگم نے بھی مجھے اپنی چچازاد بہن سائقہ کی نند کے لیے رشتے کی بات بتا رہی تھی۔ چار نندوں میں سب سے بڑی نند ”افسانہ“ ہے، پڑھی لکھی سگھڑ لڑکی ہے۔

ارے چچا جان کے سمدھی جمیل صاحب۔۔۔۔ کو تم جانتے ہو، انھوں نے یاددہانی کرائی۔

سفید پوش اور بااخلاق لوگ ہیں۔ میں اس سلسلے میں ثمینہ سے بھی مشورہ کرتا ہوں اور کہو تو لڑکی کی تصویر بھی دکھا سکتا ہوں۔ یہ کہہ کر وہ چلے گئے۔

دو دن بعد تصویر کا لفافہ نسیم صاحب کو تھمایا۔ انھوں نے تصویر دیکھی، ٹھیک ہے سوچ کر بتاتا ہوں۔

ہفتہ گزر گیا تو خالد صاحب نے ایک شام خود پوچھ لیا۔

تم نے رشتہ کے بارے میں کچھ سوچا نسیم؟ تصویر دیکھی۔

رشتہ، تصویر۔۔۔؟ ڈرائنگ روم سے آتی باتوں کی آواز سن کر باہر جاتے ہوئے ارحم کے قدم نہ چاہتے ہوئے بھی رک گئے، ایک انجانی خوشی سے وہ ہمہ تن گوش تھے۔

ہاں۔۔۔۔۔ نسیم صاحب نے کچھ توقف سے کہا۔

میں نے بہت سوچ، سمجھ کر فیصلہ کیا ہے لڑکی بھی مجھے پسند آئی ہے مگر ”اپنے لیے“۔ گھر کے سارے حالات سے تم واقف ہو بہتر یہی ہے کہ پہلے میں شادی کرلوں تاکہ ارحم کی شادی کی تیاریاں اور گھر کی ذمہ داریاں سنبھالنے کے لیے ان کی نئی ماں موجود ہو۔

دل کی چوری چھپانے کا یہ اچھا بہانہ تھا۔

□□□

Nilofar Parveen
Gachhi Tola, Ward No. 24
Araria-854311 (Bihar)

ڈاکٹر اشرف آثاری

احساسِ محرومی اور خواتین

موجودہ دور کمپٹشن اور نئی نئی ایجادات کا دور ہے سائنس کی ترقی اور ایجادات نے انسانی عقل کو حیران و ششدر کر کے رکھ دیا ہے۔ کچن میں رکھے جانے والے ایک رائس ککر سے لے کر کسی سیارے پر کام کرنے والی خود کار مشینوں اور کمپیوٹر کی ایجاد نے ایک انقلاب بپا کیا ہوا ہے۔ یہ عمل جاری بھی ہے اور روبہ ترقی بھی، اور رہتی دنیا تک جاری بھی رہے گا۔ ہر مرحلے اور ہر قدم پر زندگی سے متعلق، ہر ایک شعبے میں، چھوٹی بڑی مشینوں کی ایجاد نے دنیا کو کہاں سے کہاں تک پہنچا دیا ہے لیکن دوسری طرف سے ان ایجادات نے انسان کو کافی آرام طلب، سست اور کمزور بھی بنا دیا ہے کہ وہ چھوٹے سے چھوٹا کام بھی، خود کو کسی زحمت میں ڈالے بغیر ہی، مشینوں سے کرانے لگا ہے۔ ہاتھوں کی انگلیوں کو ہلا کر، وہ بڑے بڑے کام بھی اب کسی ذاتی محنت و مشقت کے بغیر ہی، سر انجام دینے لگا ہے جس سے وہ لازمی طور پر کاہل الطبع اور کام چور بھی بن گیا ہے۔

اسباب و وجوہات میں ایک اور چیز کو بھی اس کا باعث ٹھہرایا جا سکتا ہے کہ آج کل خود انحصاری کا دور ہے ہر شخص اپنے چھوٹے بڑے کام خود ہی کرنا چاہتا ہے کسی دوسرے کا دستِ نگر ہوئے بغیر ہی، اور ایک وقت وہ بھی تھا جب گھر میں ایک شخص کماتا تھا اور باقی کھاتے تھے اور آج گھر کا ہر فرد کماتا ہے پھر بھی زندگی کی ضروریات کو پورا کرنا اگر ناممکن نہیں تو مشکل ضرور بن گیا ہے۔ ہر کوئی شخص خود ہی کمانے اور کھانے کے چکر میں پھنسا ہوا ہے۔ زندگی گزارنے کے ان نئے طور طریقوں سے سب کچھ بدل چکا ہے۔ عادات و اطوار، رہن سہن، طرز معاشرت وغیرہ اور اس سب کا لازمی اثر انسان کی صحت پر بھی پڑا ہے، خاص طور پر نفسیاتی صحت پر۔

انسانوں کی چاروں طرف جہاں اتنی نعمتیں بکھری پڑیں ہیں وہاں زندگی میں کسی نہ کسی چیز کی کمی یا محرومی بھی رہتی ہے۔ انتہائی خوش و خرم، کامیاب و کامران اور خوشحال لوگ بھی کسی نہ کسی محرومی و کمی کا شکار رہتے ہیں ہر ایک شخص اپنی اپنی محرومی یا کمیوں کا خود ہی خیال رکھتا ہے یہی کمی، محرومی اسے احساس کمتری میں مبتلا بھی کر سکتی ہے۔

چاہیے تو یہ تھا کہ دوسروں کی کامیابیوں اور کامرانیوں پر حسد کرنے کے بجائے اپنی خصوصیتوں، خوبیوں اور انفراد پر نظر رکھی جائے اور انھیں قدرت کی عطا سمجھ کر قبول کر لیا جائے اور ان کے ساتھ ساتھ جو گونا گوں خوبیاں ملی ہیں انھیں پر اکتفا کیا جائے، کسی کو اچھی اور لبھاؤنی صورت مل گئی ہے تو کسی کو اچھی سیرت، کسی کو تیز اور زرخیز دماغ ملا ہے تو کسی کو عقل و خرد سے بالکل بے گانہ بھی رکھا گیا ہے کسی کو دولت ذہانت، قابلیت اور ہنر ملا ہے تو کسی کو ان اور ان جیسی خصوصیات سے جزوی یا کلی طور پر محرومی بھی مل گئی ہے تمام دنیا کے انسانوں کے انفراد و اختصاص سے ہی کاروبار دنیا رواں دواں ہے اور دنیا میں توازن بھی برقرار اور قائم ہے۔ کارِ جہاں کو چلانے والے کارندے یکساں بھی ہیں اور یکساں نہیں بھی ہیں۔

انسانی فطرت بھی عجیب و غریب شئے ہے کہ اپنی خوبیوں اور صلاحیتوں کی قدر و منزلت سے واقف نہیں ہے، صرف اس چیز کے بارے میں متفکر و پریشان رہتا ہے جو اس کے پاس نہیں ہوتی، اسے اس کی کمی اور محرومی بہت ستانے لگتی ہے اس کی مثال یوں بھی سمجھائی جاسکتی ہے کہ اگر ایک معمولی شکل و صورت والی، نوجوان لڑکی، کسی حسین و جمیل اور خوبصورت لڑکی کو دیکھے تو وہ بھی اس جیسی ہی بننا چاہتی ہے حالانکہ یہ سب اس کے بس میں نہیں ہوتا، پھر بھی اپنی خواہش کو تکمیل تک نہ پہنچتے ہوئے دیکھ کر، وہ مایوس و ناامید سی ہو جاتی ہے جو اسے احساس محرومی یا احساس کمتری کی طرف لے جاتی ہے، وہ اس یا اس جیسی ہی صورت حال سے نمٹنے کے لیے اپنی بھرپور قابلیتوں اور صلاحیتوں اور فہم و ادراک کا استعمال نہ کرنے پر مزید پریشانیوں میں مبتلا ہو جاتی ہے۔

اسی طرح اگر کسی مرد کو خوبصورت اور پسند کی بیوی مل جائے مگر دونوں کے مزاجوں میں ہم آہنگی نہ ہو اور آسمان و زمین کا فرق ہو، دونوں کے عادات و اطوار، مشاغل، وطیرہ الگ الگ اور متضاد ہو ایسی صورت حال بھی احساس محرومی کا باعث بن سکتی ہے۔ یہی کیفیت کسی کے بہت زیادہ مالدار، اور کسی کے مالدار نہ ہونے پر بھی پیدا ہو سکتی ہے عہدہ، رتبہ وغیرہ بھی اثرانداز ہو سکتے ہیں۔

عام طور پر جب ہم کسی مالدار اور امیر شخص کو دیکھتے ہیں تو ہمارے دل میں بھی یہ خواہش پیدا ہوتی ہے کہ اے کاش ہم بھی اس جیسے ہی ہوتے، انسانی فطرت ہی کچھ اس طرح کی ہے کہ جب ہم اپنے سے برتر کسی شخص کو دیکھتے ہیں تو فوراً ہمارا دل و دماغ للچا جاتا ہے اور عجیب طرح کے احساسات ہمارے اندر پیدا ہو جاتے ہیں اور فوری طور پر ہمارا ذہن اس طرف نہیں جاتا کہ اس شخص کی کامیابیوں کے پیچھے اس کی انتھک کوششوں اور بھرپور کاوشوں کا ہاتھ ہوگا اور پھر اس کی ذہانت و قابلیت اور اس کی عقل و فہم کا بھی، ہمیں چاہیے کہ ہم احساس کمتری یا پھر احساس محرومی کے بجائے مثبت سوچ، صبر و تحمل اور بردباری سے ایسے مسائل کا حل تلاش کریں جو خالصتاً ہمارے ہی ذہن کی پیداوار ہوتے ہیں کہیں اور سے نہیں آئے ہوئے ہوتے ہیں۔

اس بات کو مختصراً یوں بھی کہا جاسکتا ہے کہ ہر ایک شخص کو اپنے حال پر مطمئن اور خوش رہنے کا گر سیکھ لینا چاہیے جو کچھ بھی جائز طریقوں سے اپنی محنت اور مشقت سے ملا ہو، اسی پر راضی اور خوش رہنا چاہیے۔ اور جب بھی کبھی احساس کمتری یا محرومی کا خیال آجائے تو اپنے سے کم تر لوگوں کی زندگیوں میں جھانکنا چاہیے۔ احساس کمتری کا متضاد، احساس برتری ہے اس کا پیدا ہونا بھی کسی لحاظ سے ٹھیک نہیں ہے، ہر ایک چیز اعتدال میں رہنی چاہیے اعتدال کا بگڑنا ہی بیماری یا بگاڑ ہے۔

احساس کمتری میں مبتلا لوگ دراصل نفسیاتی مریض ہوتے ہیں ان کی ایک مشترکہ خصوصیت یہ بھی ہوتی ہے کہ یہ جب دوسروں کا مقابلہ کرنے کے قابل نہیں ہوتے تو انھیں نیچا دکھانے یا ثابت کرنے کے لیے ان میں طرح طرح کے نقص ڈھونڈھ نکالتے ہیں، یہ کام کرتے ہوئے انھیں ایک خاص قسم کی تسلی سی مل جاتی ہے۔

اولاد کے بارے میں ہر انسان بہت حساس ہوتا ہے اور چاہتا ہے کہ اولاد زیادہ سے زیادہ ترقی کرے، اچھی بات ہے لیکن دوسروں پر انھیں ترجیح

دینا اور دوسرے بچوں سے حسد کرنا عقلمندی کی بات نہیں ہے۔ اسطرح سے جب وہ اپنے اور غیر بچوں کی خامیوں اور خوبیوں کو گنانے لگتے ہیں تو انھیں تمام تر خوبیاں اپنے بچوں اور خامیاں دوسروں کے بچوں میں نظر آتی ہیں۔ اس طرح سے دوسروں کی کامیابیوں میں رکاوٹ ڈالنے کا رجحان پنپنے لگتا ہے۔

مردوں کے مقابلے میں خواتین احساس محرومی کا زیادہ شکار رہتی ہیں، دوسری خواتین کو اپنے سے زیادہ کپڑے اور زیورات پہنتے ہوئے دیکھ کر اداس ہو جاتی ہیں یہاں تک کہ آرائش و زیبائش یا پھر فطری حسن و خوبصورتی کے معاملے پر بھی، جو خدا کی دی ہوئی چیزیں ہیں اور جن پر انسان کا بس بھی نہیں چلتا، لیکن وہ پھر بھی اداس ہو کر احساس محرومی کا شکار ہو جاتی ہیں اور ان سے حسد بھی کرنے لگتی ہیں کبھی کبھی اس معاملے کو زیادہ سنجیدگی سے لینے سے، لڑائی جھگڑے کی نوبت تک بھی آ جاتی ہے اور گھر کا سکون برباد ہو جاتا ہے۔

دنیا میں کوئی بھی شخص اپنے آپ کے مکمل ہونے کا دعوی نہیں کر سکتا ، ہر کسی میں کوئی نہ کوئی خامی یا کمی ضرور ہوتی ہے، کسی میں بڑی تو کسی میں چھوٹی ، بہت زیادہ دولت مند، خوبصورت، اور خوشحال لوگ بھی کسی نہ کسی محرومی کے شکار ہوتے ہیں اور ہر شخص کی اپنی اپنی پسند اور ترجیحات ہوتی ہیں۔ سوچنا یہ چاہیے کہ ہمارے پاس جو ہے اور جتنا ہے اس پر ایک تو راضی رہیں اور دوسرا اس کا سوچ سمجھ کر صحیح استعمال بھی کریں۔

احساس محرومی کا صحت اور مزاج پر بھی اثر پڑ سکتا ہے اس میں مبتلا شخص چڑ چڑا، بیمار، سست، جھگڑالو، تنہائی پسند اور خاموش طبع بھی بن سکتا ہے۔ اب اگر کوئی شخص اس بیماری یا وہم میں مبتلا ہو گیا ہے تو کیا وہ اس سے باہر آ سکتا ہے اور اس میں خود اعتمادی Self Confidence آ سکتی ہے؟ اس کا جواب ہاں میں ہے کوشش، محنت اور لگن مشکل سے مشکل ترین کام کو بھی ممکن بنا دیتی ہے۔ صرف اس کا فارمولا سمجھ آنے کی دیر ہے ایک مختصر سی مثال کے زریعے اس کو یوں سمجھایا جا سکتا ہے وہ یوں کہ ایک دودھ پیتا ہوا بچہ جب ایک سال کی عمر کا ہو جاتا ہے تو وہ اپنے پاؤں پر کھڑا ہو کر چلنے کی کوشش و سعی کرتا ہے اس کوشش و سعی میں وہ لاتعداد بار گرتا رہتا ہے لیکن پھر اٹھتا ہے اور اس کی یہ کوشش اس وقت تک جاری رہتی ہے جب تک وہ نہ چلنا سیکھ جائے اور ایک دن اسے مکمل کامیابی مل جاتی ہے۔ بار بار گرنا اس کے عزم واستقلال کو متزلزل نہیں کرتا، اپنے پاؤں پر کھڑا ہو کر چلنا، اسے پر اعتماد بنا دیتا ہے۔ بظاہر یہ ایک چھوٹی سی اور معمولی مثال ہے لیکن اس میں پوشیدہ سبق اور نصیحت کی تہہ تک پہنچنا اور اس پر عمل کرنا ہماری زندگیوں میں ایک مثبت اور خوشگوار تبدیلی لا سکتا ہے اور یہی خود اعتمادی کا راز بھی ہے۔

جتنی کوشش ہم کریں گے اور جتنی ہمیں اپنی صلاحیتوں پر اعتماد اور بھروسہ ہوگا، کامیابی کے اتنے ہی امکانات موجود ہونگے۔ اور جتنا ہم منفی اور پست ہمت کرنے والی سوچوں اور خیالات کو پیچھے چھوڑیں گے اور انھیں پس پشت ڈالیں گے اتنا ہی منزلِ مقصود کی طرف آگے بڑھنے پر ہمارا فوکس رہے گا۔ اس کے ساتھ ساتھ اگر کوئی حوصلہ افزائی کرنے والا بھی موجود ہو تو سونے پر سہاگہ۔

پیہم سعی و کوشش، جہد مسلسل، اپنی صلاحیتوں پر یقین و بھروسہ، منفی لوگوں اور سوچوں سے گریز، کامیابیوں سے حاصل شدہ فوائد و ثمرات پر نظر اور ناکامیوں سے سبق سیکھنا، بنیادی طور پر وہ اجزا ہیں جن سے خود اعتمادی کی لازوال دولت حاصل کی جا سکتی ہے۔

ہمارے معاشرے میں زیادہ تر خواتین، احساسِ محرومی کی اس لیے بھی شکار ہیں کہ ہمارے گھروں میں موجود زیادہ تر خواتین ، مردوں کی دست نگر ہیں اور انھیں برابری کا درجہ میسر نہیں ہے ان میں تعلیم و تربیت کا فقدان ہے اور کل تک گھر کی چار دیواری میں قید رہنے کو ان کا نصیب سمجھا جاتا تھا اور انھیں وہ حقوق نہیں مل رہے تھے جو ملک کے آئین اور قانون نے انھیں دیے رکھے ہیں۔ اب یہ صورت حال بہت حد تک تبدیل ہو چکی ہے۔ خاص طور پر شہروں اور قصبوں میں، جہاں ملکی خواتین کی ایک بہت بڑی تعداد رہائش پزیر ہے۔ اگر چہ کچھ دور دراز اور پسماندہ علاقے آج بھی ایسے ہیں جن کی حالت کچھ بہتر نہیں ہے۔ آج خواتین مردوں کے شانہ بہ شانہ چل رہی ہیں اور کام کر رہی ہیں۔ انھیں وہ سب حقوق و مراعات مل رہے ہیں جن کی وہ مستحق ہیں اور ان کی بہتر تعلیم و تربیت پر بھرپور توجہ دی جا رہی ہے، جس کی تصدیق اس بات سے بھی ہوتی ہے کہ آج کل اکثر امتحانوں میں لڑکیاں آگے آگے دکھائی دے رہی ہیں اور ہر فیلڈ میں مردوں کے ساتھ مل جل کر بڑے بڑے کام انجام دے رہی ہیں جس سے یہ تاثر مل رہا ہے کہ خواتین کسی بھی معاملے میں مردوں سے پیچھے یا کم نہیں ہیں۔

خواتین کو بھی چاہیے کہ وہ کسی بھی معاملے میں اپنے آپ کو کمتر نہ سمجھیں، خود انحصاری، بلند حوصلہ اور مصمم ارادہ ہی انھیں احساس کمتری سے بچا سکتا ہے اور پھر اچھی تعلیم و تربیت اور اپنے اوپر یقینِ کامل بھی۔

* * *

Dr. Ashraf Asari
Sudrabal, Hazratbal
Srinagar-190006 (Kashmir)
Mob: 9419017246, 77780963728

مراسلہ

مجی، سلام مسنون۔

”خواتین دنیا“ دسمبر 2023 موصول ہوا۔ اس کی ترتیب کوئی آٹھ اصناف سخن سے مزیّن ہے اور جس کے تحت کوئی 20 ذیلی مضامین آراستہ ہیں۔ اس درخشاں شمارہ کے لیے 16 مصنّفین نے اپنا دست تعاون دراز کیا ہے۔ جن میں 12 سے زائد خواتین قلمکار شامل ہیں۔ اس کا سرورق خوبصورت، رنگین، باہم الجھے ہوئے مثلثوں کا مظہر ہے۔ یہ تکونی تکوین رنگ برنگ گلوں کا گویا گلزار ہے۔ مشعل اداریہ میں خواتین کی خیر خواہی کی خاطر انتہائی تڑپ کا مظہر ہے کہ اگر وہ زیور تعلیم سے آراستہ ہو جائیں تو نہ صرف زندگی کے ہر شعبہ کو رونق بخش سکتی ہیں بلکہ اپنی نسلوں کو اعلیٰ درجہ تک پروان چڑھا سکتی ہیں۔ البتہ انھیں اخلاقی تعلیمات کی آموزش بھی یکساں ضروری ہے کہ مبادا اُن میں زراندوزی کا رجحان نہ پروان چڑھ جائے۔ شخصیت کے ذیل میں محترمہ عذرا انجم نے تاریخ کے خونیں باب سے ”ایام غدر کی شاعرہ نواب اختر محل اختر“ پیش کیا ہے۔ البتہ اُنھیں افسوس اس بات کا ہے کہ جہاں فرنگیوں نے ادبیات کی دست برد کی ہے وہیں بے شمار شاعرات کا عمدہ عمدہ کلام بھی غارت کر گئے۔ پھر اُن پر زیادتی یہ بھی ہے کہ اہل وطن نے بھی ان کے ادبی شاہکاروں سے بے اعتنائی برتی۔ گاہ گاہ انھوں نے اپنے مقالہ کو عمدہ اشعار سے سنوارا ہے جو اُن میں تحقیق و تجسس جیسی صفات کو اجاگر کرتے ہیں۔ پڑھنے کے لائق عمدہ مضمون ہے۔ ”شاعرات کے مختلف اشعار“ بہت خوب ہیں۔ بطور خاص آرائش کے اشعار میں بڑی زیبائش ہے۔ الفاظ میں بندش، خیال عمدہ اور بے قراری میں قائم قرار ہے۔ ”جہانِ نسوان“ میں گیارہ مقالات درج ہیں۔ پہلا مقالہ محترمہ رضیہ پروین نے پیش کیا ہے۔ عنوان ہے ”سرلا دیوی اور افسانہ ”نیا جنم“۔ ظاہر ہے کہ انہوں نے سرلا دیوی اور ان کے افسانے میں نیا جنم کا بکھان کیا ہے۔ پر پیش کش بہت عمدہ ہے۔ مصنفہ کو زبان و بیان پر بڑی قدرت حاصل ہے۔ محترمہ گلفشاں انجم نے ”منفرد خاکہ نگار شوکت تھانوی“ پیش کیا ہے۔ انھوں نے لکھا یا پتہ نہیں کس نے لکھا کہ شوکت تھانوی 2 فروری 1904 کو پیدا ہوئے اور 14 مئی 1904 کو مر گئے۔ گویا محض تین ماہ کی بالی عمر میں طنز و مزاح کا ایسا ہنگامہ برپا کر گئے ! مقام استعجاب ہے!! مضمون اچھا ہے اس لیے کہ اس میں اقتباسات کے جو چند پیوند پیوست ہیں وہ بڑے لطف اندوز ہیں۔ ایک اہم خبر کہ ”مصنوعی ذہانت“ عائشہ سلما نے پیش کی لیکن درحقیقت یہ کیا ہے اس کی صراحت مصنوعی ذہانت کے حوالے ہوگئی ہے۔ یہ تمام تر مضمون ہی لگتا ہے کہ مصنوعی ذہانت کی خرد برد کا نتیجہ ہے۔ بقیہ مضامین بھی اس ”جہانِ نسوان“ کی زیب و زینت میں اضافہ کا باعث ہیں۔ ”حسن سخن“ میں بے قافیہ نظمیں شامل ہیں جو واقعتاً اچھی نظمیں ہیں اور داد دینے کو جی چاہتا ہے۔ ”افسانہ“ میں تین افسانے شامل ہیں۔ ڈاکٹر فرخندہ ضمیر نے افسانہ بعنوان ”ادیب“ پیش کیا ہے۔ تمام تر افسانہ میں گہرا طنز پوشیدہ ہے مگر نہایت چابکدستی سے پیش کیا گیا ہے۔ اُردو کے بارے میں بھی اس میں کسک سی محسوس ہوتی ہے جو وہ کہتی ہیں وہ حقیقت ہے، حق ہے۔ بہت عمدہ افسانہ ہے۔ مبارکباد۔ فرحہ جبین سلمہا نے خط کی ہیئت میں افسانہ ”کہاں ہو تم“ تحریر کیا ہے۔ پر یہ کسک سے پُر ہے۔ محترمہ محمودہ قریشی نے افسانہ ”اُردو ہے میرا موبائل“ پیش کیا ہے۔ پر یہ افسانہ سے بڑھ کر معلوماتی داستان ہے۔ اس میں کیا نہیں ہے۔ موبائل ہے۔ فیض ہیں۔ امیر خسروؒ ہیں۔ ڈھول دھماکے، دلہن کی ماں کی بے بسی۔ اچھا مضمون ہے پلاؤ کی طرح اس میں ہر چیز کا ذائقہ ہے۔ ”صحت“ کے ذیل میں ڈاکٹر محمد صفوان قدوائی سے مہاسوں کی پیش رفت اور مدافعت سے روشناس کرایا ہے۔ ”مراسلہ“ کے ذیل میں دو تعریفی و تہنیتی خطوط شامل ہیں۔ اتنا معلوماتی اور ایسا تفریحی سماں جو اس شمارے نے باندھا ہے اس کی ثنا خوانی میں یہ شعر حاضر ہے۔ فیض

جو پھول سارے گلستاں میں سب سے اچھا ہو
فروغ نور ہو جس سے فضائے رنگیں ہیں

مصطفی ندیم خاں غوری، زرّین ولا، بی-11، گرین ویلی،
روضہ باغ، اورنگ آباد (مہاراشٹرا) 431001

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی چند مطبوعات

ہمایوں نامہ

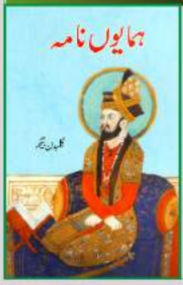
ہمایوں نامہ
گلبدن بیگم

مصنف: گلبدن بیگم
چھٹی اشاعت: 2021
صفحات: 92
قیمت 55 روپے

دامان مریم

مصنف: محمد حسن، تحقیق وترتیب: جمیل اختر
پہلی اشاعت: 2021
صفحات: 192
قیمت: 160 روپے

اردو-ہندی لغت

اردو-ہندی لغت

ایڈیٹر: ڈاکٹر روپ کرشن بھٹ
کوآرڈینیٹر: مسرت جہاں
تیسری طباعت: 2021
صفحات: 416، قیمت: 125 روپے

اردو میں نظم معرا اور آزاد نظم (ابتدا سے 1947 تک)

اردو میں
نظم معرا
اور
آزاد نظم
حنیف کیفی

مصنف: حنیف کیفی
چوتھی اشاعت: 2021
صفحات: 580
قیمت 270 روپے

کلیات امور طبیعیہ

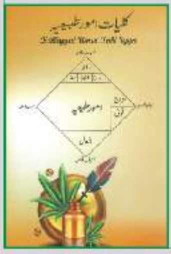
کلیات امور طبیعیہ

پہلی اشاعت: 2020
صفحات: 288
قیمت: 145 روپے

عوامی ذرائع ابلاغ ترسیل اور تعمیر وترقی

عوامی ذرائع ابلاغ ترسیل اور تعمیر وترقی

مصنف: دیوندر اسر، مترجم: شاہد پرویز
دوسری طباعت: 2021
صفحات: 173
قیمت: 105 روپے

تیمارداری

مصنف: حسین فاروقی
چوتھی طباعت: 2021
صفحات: 262
قیمت: 135 روپے

اچھی صحت کا راز

اچھی صحت کا راز

مصنف: فیروز بخت احمد
پہلی اشاعت: 2021
صفحات: 16
قیمت: 20 روپے

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، ونگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066
فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159، E-mail: books@ncpul.in

माहनामा ख्वातीन दुनिया मासिक, जनवरी – २०२४वर्ष: ८, अंक: १
Mahnama Khawateen Duniya Monthly January 2024 ,Vol. 8, Issue: 1
National Council for Promotion of Urdu Language
Ministry of Education , Department of Higher Education, Government of India

RNI. No. DELURD/2017/74026
DL (S)-17/3555/2024-26
ISSN 2581-4826
Date of Publication: 13-01-2024
Date of Dispatch : 14 and 15 of every month
Total Pages: 64

سوچھ بھارت
ایک قدم صفائی کی جانب

اردو زبان میں علم و آگہی کا معتبر ادبی جریدہ

قومی اردو کونسل کی منفرد پیشکش

اردو زبان وادب سے متعلق اہم تنقیدی و تحقیقی موضوعات پر فکر انگیز اور تلاش و جستجو کو صحیح سمت دینے والے
مواد کے ساتھ ہر تین ماہ بعد منظرِ عام پر آنے والا نہایت سنجیدہ علمی مجلّہ خود بھی پڑھیں اور دوسروں کو بھی پڑھنے کا مشورہ دیں!

ہندستانی خریداروں کے لیے سالانہ قیمت: 100 روپے، فی شمارہ: 25 روپے
(قومی اردو کونسل کی ویب سائٹ، http://www.urducouncil.nic.in پر بھی دستیاب)

منگانے کے لیے رابطہ کریں:

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، وِنگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی–110066
فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159، E-mail.: sales@ncpul.in

Printed and Published by Prof. Dhananjay Singh, Director NCPUL, on behalf of National Council for Promotion of Urdu Language,
and printed at S.Narayan and sons, B-88 Okhla Indl. Area Phase II. New Delhi-110020
And Published at Farogh-E-Urdu Bhawan FC-33/9 Institutional Area Jasola New Delhi-110025